ڈاکٹر فرمان فتحپوری

دریائے عشق اور بحر المحبّت

کا

تقابلی مُطالعہ

ناشران
تاجران

آئینۂ ادب

چوک مینار
انارکلی

لاہور

دریائے عشق اور بحر المحبت

کا

تقابلی مطالعہ

اچھی کتاب

کا

نکھار ہمیشہ

قائم

رہتا ہے

دریائے عشق اور بحرالمحبت

کا

تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری
شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی

آئینۂ ادب چوک مینار انارکلی لاہور

جملہ حقوق محفوظ

پہلی بار ۱۹۷۲ء

تعداد : گیارہ سو

قیمت : تین روپے

اہتمام

م ع اسلام - آئینہ ادب - چوک مینار

انارکلی ——— لاہور

فون نمبر ۶۷۵۰۴

——— اشرف پریس لاہور میں چھپی۔

برادرم ذاکر

کی رفاقت و محبت کے نام

فہرست

کتاب سے پہلے

میرؔ و مصحفیؔ دونوں غیر معمولی شاعر ہیں۔ دونوں نرم لہجے میں شعر کہتے ہیں اور عشقیہ جذبات خصوصاً المیہ پہلوؤں کو مؤثر انداز سے پیش کرنے میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ قدیم تذکرہ نگاروں سے لے کر آج تک کے سارے ممتاز ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ میرؔ و میرزا کے عہد کی زبان اور شعری روایات کو جس کامیابی اور جس سلیقے سے مصحفیؔ نے برتا ہے کسی اور نے نہیں برتا لیکن اپنی افتادِ طبع کے سبب وہ سوداؔ کے مقابلہ میں میرؔ سے زیادہ قریب ہیں۔ یہی سبب ہے کہ میرؔ کی طرح مصحفیؔ کے شاعرانہ جوہر بھی قصیدہ یا ہجو میں نہیں، غزل اور عشقیہ مثنوی میں کھلتے ہیں۔

میر تقی میرؔ کی اب تک چھوٹی بڑی سینتیس مثنویاں دستیاب ہوئی

ہیں[1]۔ ہر چند کہ یہ سب اپنے عہد کی تہذیبی زندگی کی ترجمان اور میر تقی میرؔ کی شخصیت و مزاج کی عکاس ہیں لیکن شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے ان کی عشقیہ مثنویاں زیادہ قابلِ توجہ ہیں۔ بلکہ مجنوں گورکھپوری کے لفظوں میں "ان کی مثنوی میں وہی جاندار ہیں جن میں کسی کی المناک داستانِ محبت نظم کی گئی ہے اور جن کی فضا شروع سے آخر تک حسن و محبت کی فضا سے سرشار ہے۔ اس قسم کی مثنویوں میں شعلۂ عشق، دریائے عشق، اعجازِ عشق، مورنامہ، جوان و عروس، خواب و خیال، معاملاتِ عشق اور جوشِ عشق کے نام آتے ہیں۔ ان میں آخری تین مثنویاں دراصل میرؔ کی منظوم آپ بیتیاں ہیں۔ "جوشِ عشق" میں میرؔ نے محبوبہ کے حسن و جمال اور اس کے فراق میں اپنے پیچ و تاب کی تفصیل دی ہے۔ "خواب و خیال" میں اپنے وطن اکبرآباد کو چھوڑنے اور محبوبہ کی جدائی میں مضطرب و بےقرار رہنے کا بیان ہے۔ "معاملاتِ عشق" میں محبت میں پیش آنے والے مختلف مرحلوں کی تصویر ہے۔ بقیہ چھ مثنویاں جگ بیتی عشقیہ افسانوں پر مشتمل

---

[1] دلی کالج میگزین میر تقی میر صفحہ ۲۶۷

ہیں۔ "شعلہ عشق" میں پرس رام اور اُس کی بیوی کی المناک داستان ہے۔ "جوان و عروس" اپنے نام کی مناسبت سے ایک نوجوان اور ایک نئی نویلی دُلہن کا عشقیہ افسانہ ہے۔ مثنوی "مور نامہ" رانی اور مور کے غیر فطری قصّے کی ترجمان ہے۔ "حکایتِ عشق" میں افغان پسر اور ایک ہندو لڑکی کے رُومان کی داستان ہے۔ "اعجاز عشق" میں ایک نوجوان کی آشفتہ سری اور عشق زدگی کی دردناک کہانی ہے۔ آخری مثنوی دریائے عشق" ایک نوجوان اور ایک حسینہ کے ربطِ باہمی کی اندوہناک تفسیر ہے۔ اور مصحفی نے اسی کو "بحر المحبّت" کے نام سے دوبارہ نظم کیا ہے۔

سوال یہ ہے کہ مصحفی نے طبع زاد قصّہ نظم کرنے کے بجائے میر کے منظوم قصّے کو مکرّر نظم کرنا کیوں پسند کیا ہے؟ سو اس سلسلے میں تقلیدِ میر کے شوق کے سوا اور کوئی سبب سمجھ میں نہیں آتا۔ جنہوں نے مصحفی کی زندگی اور کلام کا مطالعہ کیا ہے اُن کی نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ مصحفی اگرچہ قدرت کی جانب سے خلّاق ذہن اور شاعرانہ صلاحیت لے کر پیدا ہوئے تھے لیکن ہمہ گیری، ہمہ رنگی، زود گوئی اور پُر گوئی کے شوق نے انہیں جدّتِ طبع سے زیادہ اساتذہ

کی دوسری افسانوی مثنویوں سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مصحفی نے میرؔ کا رنگ مثنوی اڑانے اور اُن کے مقابلہ میں بہ حیثیت مثنوی نگار شہرت پانے کی غرض سے میرؔ کی مثنوی "دریائے عشق" کو دوبارہ نظم کرنا پسند کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مصحفی اپنی مثنوی کے ابتدائی اشعار میں اس قسم کا دعویٰ نہ کرتے کہ ؎

گرچہ ہے کلکِ میرؔ نادرہ کار	تو بھی ندرت کو اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا	دے ذرا اور بھی تو حسن ملا
سطحِ کاغذ پہ کھینچ وہ تصویر	جس سے حیراں رہیں صغیر و کبیر
رمزِ شق القمر جتا دے تو	معجزہ اپنا تک دکھا دے تو

مصحفی کو میرؔ کے مقابلے میں کس حد تک کامیابی ہوئی ہے اور اُنہوں نے جو دعویٰ مذکورہ بالا اشعار میں کیا ہے اسے کس حد تک پورا کر دکھایا ہے، زیرِ نظر کتاب میں اسی سوال کا مفصّل و مدلّل جواب تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میری یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہے اس سلسلے میں رائے دینے کا حق آپ کو ہے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے دریائے عشق اور بحر المحبت دونوں کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ ان کے متعلق مختلف مبصروں اور ناقدوں نے جو کچھ کہا ہے

اُسے دیکھا ہے۔ ساتھ ہی میرؔ و مصحفیؔ کی دوسری مثنویوں پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد ان کے متعلق رائیں قائم کی ہیں۔ دریائے عشق کے بارے میں تو خیر بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن بحر المحبّت کے سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے مقدمے کے سوا تفصیل سے اور کچھ نہیں ملتا۔ یہ مقدمہ چونکہ اکلوتا ہے اس لئے خوب تر ہونے کے ساتھ ساتھ بعض وجوہ سے گمراہ کُن بھی ہے۔ میں نے اس مقدّمے کو بار بار پڑھا ہے اور جرح و بحث کے بعد جہاں جہاں تائید یا اختلاف کے مواقع آئے ہیں اپنی رائے کا واشگاف اظہار کر دیا ہے۔ آخر میں دونوں مثنویاں یوں شامل کر دی گئی ہیں کہ ان کے مطالعہ کے بغیر نہ کوئی شخص ان مثنویوں کے مباحث سے پورا لطف اٹھا سکتا ہے اور نہ صحیح رائے قائم کر سکتا ہے۔

شعبۂ اُردو۔ کراچی یونیورسٹی   فرمان فتح پوری

۳۰۔ ستمبر ۱۹۷۱ء

دریائے عشق اور بحر المحبّت

کا تقابلی مطالعہ

میرؔ کی افسانوی مثنویوں میں "شعلۂ عشق" اور "دریائے عشق" سب سے بہتر ہیں۔ پھر بھی بلحاظ افسانہ جو کشش "دریائے عشق" میں ہے، وہ "شعلۂ عشق" میں نہیں ہے۔ دونوں کا موضوع اگرچہ عشقیہ ہے لیکن عشق کی نوعیتوں میں بڑا فرق ہے۔ شعلۂ عشق میں مرد کو اپنے ہم جنس یعنی مرد سے عشق کرتے دکھایا گیا ہے۔ اس کے برعکس "دریائے عشق" میں عورت اور مرد کی محبّت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ دریائے عشق کے افسانے میں وہ تصنع اور آورد کہیں نہیں ہے جو شعلۂ عشق کے غیر فطری افسانے میں جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ دریائے عشق

میں ہیرو اور ہیروئن دونوں کے کردار، ماحول اور اقتضائے بشری کے مطابق دکھائے گئے ہیں۔ ان سے وہی افعال سرزد ہوتے ہیں اور وہی کارنامے انجام پاتے ہیں جو سچے عاشقوں کے شایانِ شان ہیں اور جن کی ان سے توقع کی جاتی ہے لیکن "شعلۂ عشق" کا ہیرو، ہیروئن کا دم بھرتے ہوئے بھی مصلحت کوش اور دُور اندیش ہے۔ اس کا عشق خام ہے اور وہ دریائے عشق کے ہیرو یا ہیروئن کی طرح "آتشِ نمرود" میں بے خطر کود پڑنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس کے برعکس دریائے عشق میں طالب و مطلوب دونوں نے ایک ہی جست میں قصہؔ تمام کر دیا ہے۔

دریائے عشق میں "دایہ" کا کردار بھی زندہ کردار ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ اسی کی مکاری سے دریائے عشق کا المیہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ ایسا جیتا جاگتا کردار میرؔ کی کسی اور افسانوی مثنوی میں نہیں ملتا شعلۂ عشق میں "دایہ" کے کردار کا کام اس نوجوان سے لیا گیا ہے، جو پرس رام کا عاشق ہے لیکن اس سے افسانے کی فضا یکسر مصنوعی اور غیر فطری ہو گئی ہے۔ جذبات کی مصوّری اور واقعہ نگاری کے لحاظ سے بھی دریائے عشق کا مرتبہ شعلۂ عشق سے بلند ہے۔ اس میں

شعلۂ عشق کی طرح صرف پرس رام اور اس کی بیوی کے درد و غم کا بیان نہیں ہے بلکہ ہیرو اور ہیروئن کے جذبات کی تصویر کشی کے ساتھ ان کے والدین کی ذہنی اُلجھن، دایہ کی مکّاری، محلّے والوں کی انگشت نمائی اور اس دور کی سماجی و معاشرتی زندگی کی عکّاسی بھی کی گئی ہے اس میں کردار نگاری کے ساتھ مکالموں کا بھی لطف ہے اور داستان بھی "شعلۂ عشق" کے مقابلہ میں طویل ہے۔ پوری داستان تقریباً تین سو اشعار پر مشتمل ہے۔ واقعات اور انداز بیان بھی شگفتہ و مُوثر ہے۔ مافوقِ فطرت قوتوں کا دخل ہے لیکن ایسے قرینے سے کہ انسانی ذہن اسے آسانی سے قبول کر لیتا ہے۔

نفسِ داستان بالاختصار یہ ہے کہ ؎

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا | لالہ رخسار و سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اُس کی چھاتی گرم
دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
ایک دن بیکلی سے گھبرایا | سیر کرنے کو باغ میں آیا
ناگہ اس کوچہ سے گذار ہوا | آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفے سے ایک مہ پارہ | تھی طرف اس کے گرم نظارہ

پڑ گئی اُس پہ اک نظر اُس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
طبع نے اک جنون پیدا کیا — اشک نے رنگِ خون پیدا کیا
خلق اس کی ہوئی تماشائی — پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی
جو کہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ — رحم کرتے تھے آشنا یانہ
عاشق اُس کو کسی کا جان گئے — سب بُرا اس ادا کو مان گئے
کیونکہ باہم معاش تھی سب کی — ایک جا بود و باش تھی سب کی

وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے
درپے دشمنیٔ جان ہوئے

عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا — مضطرب کد خدائے خانہ ہوا
گھر میں جا بہرِ دفعِ رسوائی — بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرتِ مہ تاباں — جا کے چندے رہے کہیں پنہاں
تب محافے میں اُس کو کر کے سوار — ساتھ دے ایک دایۂ غدّار
پار دریا کے جلد رخصت کی — اس طرح فکر رفعِ تہمت کی
گھر سے باہر محافہ جو نکلا — اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا
طپش دل سے ہو کے وہ آگاہ — ہو لیا ساتھ اُس کے بھر کر آہ
بیچ دریا میں دایہ نے جا کر — کفش اس گل کی اُس کو دکھلا کر

پھینکی پانی کی سطح پر اک بار — اور بولی کہ اے جگر افگار

حیف! تیرے نگار کی پاپوش — موج دریا سے ہووے ہم آغوش

غیرت عشق ہے تو لا اس کو

چھوڑ یوں مت برہنہ پا اس کو

سن کے یہ حرفِ دایۂ مکار — دل سے اس کے گیا شکیب و قرار

بے خبر کارِ عشق کی تہ سے — جست کی اس نے اپنی جاگہ سے

جب کہ دریا میں ڈوب کر وہ جواں — کھو گیا گوہر گرامی جاں

دایۂ حیلہ گر ہوئی دلشاد — واں سے کشتی چلی برنگ باد

قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ

آئی وہ رشکِ مرز خود رفتہ

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ — ہو گیا غرق وہ فرومایہ

مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر — ایک دو دم رہیں گے دریا پر

حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی — دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ

یاں گرا تھا کہاں؟ وہ کم مایہ

سنتے ہی یہ کہانی کہہ کر — گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کر کر

کششِ عشق آخر اس مہ کو ۔۔۔ لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو

خلق یک جا ہوئی کنارے پر ۔۔۔ حشر برپا ہوئی کنارے پر

نکلے باہم وے موئے نکلے ۔۔۔ دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

جو نظر اُن کو آن کرتے تھے

ایک قالب گمان کرتے تھے[1]

اب تک میرؔ کی یہ منظوم داستان طبع زاد خیال کی جاتی تھی لیکن منظوم داستانوں کے تحقیقی و تفصیلی مطالعہ سے پتہ چلا کہ اس قصے کے مخترع میرؔ نہیں ہیں بلکہ انہوں نے دوسرے منظوم قصوں سے اس کا پلاٹ مستعار لیا ہے۔ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے "میر کی مثنوی دریائے عشق کے ایک ماخذ" کے عنوان سے لکھا ہے کہ میرؔ کا قصہ دراصل ایک فارسی مثنوی قضا و قدر سے ماخوذ ہے۔ یہ فارسی مثنوی ۱۱۱۳ھ میں تصنیف ہوئی ہے اور تقریباً سو سال بعد میرؔ نے اُسے اردو میں منتقل کیا ہے[2] خواجہ احمد فاروقی نے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کی رائے پر تنقید کرتے ہوئے

---

[1] کلیاتِ میر مرتبہ عبدالباری آسی مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۹۴۰ء صفحہ ۹۰۰ تا صفحہ ۹۱۰ [2] رسالہ اردو کراچی اپریل ۱۹۵۱ء

لکھا ہے کہ فارسی مثنوی شاعرانہ اور فنی حیثیت سے میرؔ کی مثنوی سے کمتر درجے کی ہے۔ قصّے میں میرؔ نے عشق کی واردات اور دایہ کے قصّے کا اضافہ کیا ہے اور اپنی نفس گرم کی آمیزش سے اُس کی ساری فضا بدل دی ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ میرؔ کی مثنوی میں میرؔ کی انفرادیت کی چھاپ ہے اور فارسی مثنوی سے بلحاظ حسن و اثر جداگانہ ہے۔ قصّے کے بعض اجزا میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی ہے۔ لیکن دریائے عشق کا اصل قصّہ فی الواقع قضا و قدر کے قصّے سے یکسر ملتا جلتا ہے اور اسے دریائے عشق کا ماخذ قرار دینا غلط نہیں ہے۔

"قضا و قدر" نامی فارسی مثنوی سے قطع نظر خود قدیم اردو میں کئی ایسے منظوم قصّے ملتے ہیں جو پلاٹ و نتیجے کے اعتبار سے دریائے عشق کے مماثل ہیں۔ ان قصّوں میں "چندر بدن و مہیار" مصنّفہ مقیمی اور "طالب و موہنی" مصنّفہ دلہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مقیمی نے اپنا قصّہ ۱۰۳۵ھ اور ۱۰۵۰ھ کے درمیان نظم کیا ہے۔ اس قصّے میں چندر بدن اور مہیار کے جنازے اس طرح ہم آغوش دکھائے گئے

۱؎ میر تقی میرؔ حیات و شاعری ص ۴۳۹

ہیں کہ کوشش کے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ نہ ہو سکے اور آخر کار دونوں ایک ہی قبر میں دفن کر دیئے گئے۔ دلہ کی منظوم داستان ۱۱۷۱ھ سے قبل لکھی گئی۔ اس کا پلاٹ بھی دریائے عشق سے بہت ملتا جلتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ دریائے عشق میں طالب و مطلوب کی لاشیں دریا سے اور طالب موہنی کی لاشیں کنوئیں سے نکالی گئی ہیں۔ لاشوں کا انجام دونوں میں یکساں ہے جس وقت طالب و موہنی کی لاشیں باہر آئیں تو لوگوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ عاشق و معشوق کی لاشیں باہم پیوستہ ہیں۔ کوشش کی گئی کہ علیحدہ کیا جائے مگر کامیابی نہیں ہوئی اور نماز جنازہ کے بعد ایک ہی قبر میں وہ دونوں دفن کئے گئے[۱]۔

دریائے عشق کے قصے کو بعد میں مصحفی نے نظم کیا اور بحر المحبت[۲] نام رکھا۔ خود لکھتے ہیں ؎

مجھ سے یہ مثنوی ہوئی جو تمام — رکھا بحر المحبت اس کا نام

بحر المحبت کی تاریخ تصنیف کا سراغ صحیح طور پر اب تک نہیں لگ

---

[۱] یورپ میں دکنی مخطوطات صفحہ ۴۳۰

[۲] دیباچہ طبع دوم بحر المحبت مرتبہ عبدالماجد دریا آبادی صفحہ ۲

سکا لیکن اب تک جو نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر کی زندگی ہی میں دریائے عشق مشہور ہو گئی تھی اور مصحفی نے میر کی زندگی ہی میں اس قصہ کو دوبارہ نظم کا جامہ پہنایا ہے۔ اس قصے کو دوبارہ نظم کرنے میں کس قسم کی ندرت کا اظہار انہوں نے کیا ہے اور کن کن مقامات پر حسن کا اضافہ کیا ہے؟ اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے دریائے عشق اور بحر المحبت کا تقابلی جائزہ لینا ضروری ہے۔

آغاز داستان سے پہلے میر نے ۲۲ اشعار عشق اور اس کی کار فرمائیوں کے متعلق اس طور پر کہے ہیں ؎

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال

دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا
کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا

کہیں آنکھوں سے خون ہو کے بہا
کہیں سر میں جنون ہو کے رہا

کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا
کہیں موجب شکستہ رنگی کا

کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ
کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ

خار خارِ دلِ غریباں ہے
انتظارِ بلا نصیباں ہے

کہیں شیون ہے اہل ماتم کا
کہیں نوحہ ہے جانِ پر غم کا

کام میں اپنے عشق پکا ہے
ہاں یہ نیرنگ ساز یکتا ہے

جس کو ہو اس کی التفات نصیب ہے وہ مہمان چند روزہ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے

کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

میرؔ کی اکثر مثنویوں کی ابتداء میں عشق کے متعلق اس قسم کے اشعار ملتے ہیں بلکہ عشق اور اس کی کیفیات و لوازم و اثرات کے متعلق جن تفصیلات و نکات کا ذکر ان مثنویوں میں ملتا ہے وہ ان کی غزلوں میں بھی مشکل سے ملے گا۔ بات یہ ہے کہ میرؔ طبعاً عاشق مزاج تھے اور انہیں ابتداء میں جو تعلیم ملی تھی وہ عشق و تصوف ہی کی تھی۔ میر صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ جب ان کے والد مجاہدے اور استغراق سے فرصت پاتے تو سمجھاتے کہ:

"بیٹا! عشق اختیار کرو۔ عشق ہی اس کارخانے پر مسلط ہے۔ اگر عشق نہ ہوتا تو یہ تمام نظام درہم برہم ہو جاتا۔ بے عشق زندگانی وبالِ جان ہے اور عشق میں دل کھونا اصل کمال ہے۔ عشق ہی بناتا ہے عشق ہی بگاڑتا ہے۔ عالم میں جو کچھ ہے عشق کا ظہور ہے۔ آگ سوزِ عشق ہے۔ پانی رفتارِ عشق ہے، خاک قرارِ عشق ہے، ہوا اضطرارِ عشق ہے۔ موت

عشق کی ہستی ہے۔ حیات عشق کی ہوشیاری ہے۔ رات عشق کا خواب ہے اور دن عشق کی بیداری ہے[1]۔"

اس تعلیم و تربیت کا اثر جو ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ میرؔ نے عشق اختیار کیا اور اس طرح اختیار کیا کہ عشق ان کا جزوِ حیات بن گیا۔ وہ صرف نظری طور پر عشق کے دلدادہ نہ تھے بلکہ اسے سرچشمۂ حیات جانتے تھے۔ دلِ پُر خوں کی ایک گلابی سے عمر بھر شرابی رہنے کا دعویٰ یونہی نہیں ہے۔ ان کی ساری زندگی عشق و محبّت میں ڈوبی ہوئی تھی اور سچ پوچھو تو اپنی اسی عشقیہ زندگی کو ڈھکائے چھپائے رکھنے کے لئے انہوں نے شعر گوئی کی آڑ لی تھی۔

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا ۔۔۔ وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ ؎

اک آفتِ زماں ہے یہ میرؔ عشق پیشہ
پردے میں سارے مطلب اپنے ادا کرے ہے

میرؔ خود اپنی عشقیہ زندگی کے متعلق ذکرِ میرؔ میں فرماتے ہیں ؎

---

[1] ترجمہ ذکرِ میرؔ۔

شعر می خواندم ، عاشقانہ می زیستم
تنہا می گریستم و عشق با خوش اندامے می کنم

یہ بھی مسلّم ہے کہ میرؔ کو عشق میں ناکامی ہوئی اور اس ناکامی کا اثر اُن کی شخصیت پر اتنا گہرا ہے کہ وہ ہزار پردوں میں بھی صاف جھلک جاتا ہے۔ اس برتی ہوئی محبّت ہی کا فیضان ہے کہ میرؔ جب عشق اور عشق کے لوازم و اثرات کا ذکر کرتے ہیں تو اُن کے اشعار سننے والوں کے دل ہلا دیتے ہیں۔ جذبہ کی صداقت اور شدّت کے اعتبار سے میرؔ کی عشقیہ شاعری میں جو اثر آفرینی، ہمہ گیری اور گھلاوٹ نظر آتی ہے وہ ابھی کسی اُردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ نہ صرف غزل بلکہ ان کی مثنویوں کی بھی سب سے بڑی خصوصیّت یہی ہے کہ عشق کا جیسا سچّا، شدید اور اثر انگیز بیان میرؔ کے یہاں ملتا ہے، وہ مجموعی حیثیت سے اُردو کے چند شعرا کے سوا کسی مثنوی نگار کے یہاں موجود نہیں ہے۔ ہر مثنوی کے آغاز میں میرؔ صاحب نے پہلے عشق کی ماہیت و کیفیت پر روشنی ڈالی ہے اور پھر عشق کی صفات و کرامات کے اظہار کے لئے کوئی حکایت نظم کی ہے۔ دریائے عشق کا بھی یہی انداز ہے اور قصّے کے آغاز سے پہلے انہوں نے عشق کے متعلق متعدد شعر کہے ہیں۔ یہ اشعار اگرچہ

کہانی سے غیر متعلق ہیں لیکن اوپر جو اشعار درج کیے گئے ہیں۔ اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اشعار دنیائے شاعری میں مرنے والے نہیں ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی صاحب بحرالمحبّت اور دریائے عشق کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

"میرؔ صاحب نے شروع کے ۲۲ شعروں میں عشق کے
عام کارنامے بیان کئے ہیں۔ مصحفیؔ کے ہاں بھی تمہید کے
۱۲ اشعار اسی رنگ کے ہیں"

خدا جانے عبدالماجد صاحب نے یہ بات کس بنا پر لکھی ہے بحرالمحبّت میں ۱۲ اشعار کیا ایک شعر بھی عشق یا عشق کے کارناموں کے متعلق نہیں ہے۔ خود ماجد صاحب کی مرتبہ بحرالمحبّت میں جو ۱۲ اشعار آغازِ حکایت سے قبل ملتے ہیں وہ عشق کے موضوع پر نہیں بلکہ وہ دُعا اور تعلّی کے انداز کے ہیں۔ میرؔ کے ۲۲ شعروں کا رنگ دیکھ چکے ہیں اب ذرا بحرالمحبّت کے ان بارہ اشعار کا رنگ دیکھئے ۵

لب زخم قلم ذرا وا ہو   تا کہیں تجھ سے نالہ پیدا ہو

---

۵ بحرالمحبّت صفحہ ۲۲۔ طبع ثانی کتب خانہ تاج آفس محمد علی روڈ بمبئی۔

ساتھ کاغذ کے عشق بازی کر — یعنی کچھ داستاں طرازی کر
کسی خستہ جگر کے حال کو لکھ — کسی سرو رواں کی چال کو لکھ
ناشکیبی کسی کی دکھلا دے — دل فریبی کسی کی لکھوا دے
کہیں پر چاک آہ کر تحریر — دے بنا زلف کی کہیں زنجیر
قصۂ عشق لیلیٰ و مجنوں — گرچہ اس قدر نہ تھا مضموں
تیری طراحیوں سے دور کھنچا — کئی اہل سخن نے اس کو لکھا
مبتذل عشق کا نہ ہو مضموں — عشق موزوں کو پھر بھی کر موزوں
گرچہ ہے کلک میر نادرہ کار — تو بھی قدرت کا اپنی کر اظہار
جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا — دے ذرا اور بھی تو حسن ملا
سطح کاغذ پہ کھینچ وہ تصویر — جس سے حیراں رہیں صغیر و کبیر

رمز عشق القصہ جتا دے تو
معجزہ اپنا ٹک دکھا دے تو

ظاہر ہے کہ ان اشعار کی نوعیت و کیفیت میر کے ابتدائی اشعار سے بالکل مختلف ہے۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ دریائے عشق کے قصے کو مصحفی نے دوبارہ نظم کر کے اس کے حسن میں کس قسم کا اضافہ کیا ہے اور کیا مصحفی کا یہ

دعویٰ درست ہے کہ اُنہوں نے میرؔ کے رنگ کو اپنے قدرت بیان سے اور نکھار دیا ہے۔ داستان کے آغاز میں میر صاحب ایک عاشق مزاج نوجوان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں ؎

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا لالہ رخسار و سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اُس کی چھاتی گرم دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
تھا طرحدار آپ بھی لیکن رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
دیکھتا گر کوئی وہ خوش پرکار رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار

سر میں تھا شوق ذوق دل میں تھا
عشق ہی اُس کے آب و گل میں تھا

مصحفیؔ اس لالہ رخسار نوجوان کا ذکر یوں کرتے ہیں ؎

ایک جا اک جوانِ خوش ظاہر تھا نپٹ فنِ عشق سے ماہر
دل پہ صدمے بہت اٹھائے تھے داغ پر داغ اُس نے کھائے تھے
گر کہیں روئے خوش نظر آتا نوکِ مژگاں تلک جگر آتا
ہو کے ممنونِ ناشکیبیٔ شوق تھا نظر باز دل فریبیٔ شوق

تپشِ دل کو راہ تھی اُس سے
چشمِ حیرت نگاہ تھی اُس سے

ان اشعار سے صاف اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مصحفی نے میر کے شعر پر شعر کہنے کی کوشش کی ہے لیکن آغازِ داستان میں مصحفی کو میر کے رنگ کو گہرا کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی بلکہ بے رنگ تقلید کا اثر جھلک گیا ہے۔ میر کے پہلے شعر میں جو تازگی، برجستگی اور لطافت ہے وہ مصحفی کے یہاں مفقود ہے۔ میر نے کہانی کے ہیرو کو "جوانِ رعنا، لالہ رخسار اور سرو بالا" جس بے ساختگی سے کہہ دیا ہے وہ مصحفی سے نہ بن سکا۔ "جوانِ رعنا" کی جگہ "جوانِ خوش ظاہر" — "فنِ عشق کا ماہر" کا خطاب دیا ہے۔ لیکن ان ترکیبوں میں تصنع اور آورد کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔ ان میں وہ زور، حسن اور اثر نہیں ہے جو میر کی ترکیبوں میں پایا جاتا ہے۔

عاشق ایک دن سیر و تفریح کے لئے نکلتا ہے اور اس کی آنکھ غرفہ سے جھانکنے والی ایک مہ پارہ پر پڑتی ہے۔ نظر ملتے ہی دونوں ایک دوسرے پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور صبر و ہوش کھو بیٹھتے ہیں۔ مصحفی اوّلین ملاقات و نظارگی کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں؎

دل تھا اس جو کا عشق آمادہ — ہو گیا اک جگہ وہ دلدادہ
یعنی اک نازنینِ گل رخسار — ہوئی غرفہ میں اس سے آدوچار

اُس کی آنکھ اس پہ اس کی اُس پہ پڑی
یک دگر جب بہم نگاہ لڑی

دل نے جب لگ کے آہ پیدا کی — لبِ خامش نے آہ پیدا کی
آنکھیں بے اختیار بھر آئیں — پلکیں ندیاں سی کچھ نظر آئیں

اشک آ حائلِ نظارہ ہوئے
جگر و دل ہزار پارہ ہوئے

میر تقی میر نے عاشق و معشوق کی نظر بازیوں اور ان کے اثرات کا ذکر اس طور پر کیا ہے ؎

ناگہ اک کوچے سے گذار ہوا — آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفہ سے ایک مہ پارہ — تھی طرف اس کے گرم نظارہ
پڑ گئی اُس پہ اک نظر اُس کی — پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ — صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بیقراری نے کم ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی

ان اشعار سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عشق کا پہلا تیر کھانے کے بعد ہیرو اور ہیروئن کی جو حالت ہوتی ہے اس کی مرقع نگاری میں

بھی مصحفیؔ کسی جدّت و ندرت سے کام نہیں لے سکے بلکہ میرؔ کے مقابلہ میں ان کا بیان پھیکا اور بے جان ہے۔ میرؔ چونکہ خود کوچۂ عشق کے نشیب و فراز سے آشنا تھے، اس لئے اُن کا بیان اس باب میں زیادہ قرینِ قیاس ہے، شدید اور اثر انگیز ہے۔ مصحفیؔ کے پہلے دونوں شعر بھرتی کے ہیں۔ ان میں برجستگی اور آمد کا پتہ نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے سرسری طور پر نثری خیالات کو نظم کا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔ ان سے ہیرو کی شخصیت، اس کے کردار، اس کی عاشقانہ افتادِ طبع پر روشنی نہیں پڑتی۔ مصحفیؔ کے اشعار میں جس عاشق مزاج ہیرو کا ذکر ملتا ہے اس میں حوصلہ مندی اور اولوالعزمی کے بجائے مجہولیت اور انفعالیت نظر آتی ہے۔ پھر موقع محل کی مناسبت کا بھی لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہیرو اور ہیروئن پہلے سے طے شدہ جگہ پر پہنچ کر نظر بازی میں مشغول ہو گئے۔ اس کے برعکس میرؔ نے اسے حادثہ بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور روئداد کو ہر طرح برمحل اور قابلِ یقین بنا دیا ہے۔ میرؔ کے یہ دو شعر ؎

ناگہ اک کوچہ سے گذار ہوا　　　آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ　　　صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

— آغازِ داستان کو متحرک و جاندار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ "ناگہ" اور "آفتِ تازہ" کے الفاظ سے انہوں نے واقعہ کو فطری بنا دیا ہے۔ دوسرے شعر کی برجستگی اور سلاست نے ہیرو کی عاشقانہ شخصیت کو جس طرح نمایاں اور دلکش بنا کر پیش کیا ہے، اس میں مصحفیؔ کو کامیابی نہیں ہوئی۔

ہیروئن دامن جھاڑ کر یکبارگی اٹھ جاتی ہے۔ ہیرو اُسے غائب پاکر اور بھی مضمحل اور مضطرب ہو جاتا ہے۔ میرؔ نے اس موقع کی تصویر یوں پیش کی ہے ؎

جھاڑ دامن وہ اپنا مہ پارہ — اُٹھ گئی سامنے سے یکبارہ
وہ گئی اُس کے سر بلا آئی — خاک میں مل گئی وہ رعنائی
دل پہ کرنے لگا طپیدنِ ناز — رنگ چہرے سے کر چلا پرواز
ہاتھ جانے لگا گریباں تک — چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک

طبع نے اک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگِ خوں کیا پیدا

میرؔ کا یہ بیان اگرچہ مختصر ہے لیکن اثر سے خالی نہیں ہے۔ مصحفیؔ نے ہیرو کی بے قراری قدرے وضاحت سے نظم کی ہے اور اُن کا

بیان اس موقع پر میرؔ سے کمتر درجے کا نہیں ہے۔ پہلا شعر اگرچہ بھرتی کا معلوم ہوتا ہے لیکن باقی تمام اشعار میں عاشق کے اضطراب کو سلیقے سے نظم کر گئے ہیں ؎

ورقِ غرفہ میں جو تھی تصویر | صاف غائب ہوئی وہ بدرِ منیر
جونہی نظروں سے چھپ گیا وہ ماہ | نظر آیا جواں کو روزِ سیاہ
جانِ مضطر ہوتن سے جانے لگی | بے خودی میں غشی سی آنے لگی
پاسِ ناموس کا اُٹھا کھٹکا | سر کو اس آستاں پہ دے پٹکا
شیشۂ دل کو چُور چُور کیا | پیرہن چاک کر کے دُور کیا
گئی سو بار سوئے غرفہ نگاہ | پر نہ آئی نظر وہ غیرتِ ماہ
تپشِ دل نے بات ہی کھو دی | بیقراری نے گھات ہی کھو دی
جاں ہونٹوں پہ آئی آہ کے ساتھ | لو ہو آنے لگا نگاہ کے ساتھ

سوزشِ دل دوچند ہونے لگی
سرِ آتش بلند ہونے لگی

ہیرو کی اس شوریدہ سری کا نتیجہ یہ ہوا کہ محبّت کا راز فاش ہو گیا اور عشق و محبّت کا یہ افسانہ زبانِ زدِ خلائق ہونے لگا۔ ہیروئن کے والدین اور قرابت داروں کو جب اس معاشقے کی خبر ہوئی تو وہ بڑے خفیف

و شرمندہ ہوئے اور ناموسِ خاندان کے لئے اس افسانے پر ہر طرح
پردہ ڈالنے کی کوشش کی جانے لگی۔ پہلے تو عاشق کو ہر طرح پریشان کیا
گیا۔ اس کے پیچھے بچّوں کا ایک گروہ لگا دیا گیا جو ہر وقت اس پر سنگباری
کرتا اور چھیڑتا رہتا۔ عاشق پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ سچا عاشق
ہے اور مصائب و شدائد سے بے خبر رہ کر محبوب کا دم بھرتا رہتا ہے
اور کوئی صورت نظر نہیں آتی تو لڑکی کے بعض رشتہ دار عاشق کو قتل کرا
دینے کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ ایک طرف اس کے پھندے سے نجات
پا جائیں، دوسری طرف اہل خاندان طعن و تشنیع سے ہمیشہ کے لئے محفوظ
ہو جائیں۔ میرؔ کے یہاں عاشق کے خلاف لڑکی والوں کی طرف سے اس
قسم کے اقدامات کا ذکر نہیں ہے۔ میرؔ نے لڑکی کے والدین اور اہلِ
خاندان کو اس واقعہ سے متاثر و متفکّر دکھایا ہے۔ لڑکی کو بدنامی
سے بچانے کی تدابیر پر بھی غور کیا ہے لیکن عاشق کو زد و کوب کرنے اور
قتل کرا دینے کی کوششیں نہیں کیں۔ مصحفیؔ نے ان واقعات کا اصل پلاٹ
میں اضافہ کیا ہے۔ اور شاید داستان کو زیادہ مؤثر، خاص طور پر ہیروئن
کے والدین کی پریشانی کو زیادہ فطری اور شدید بنا کر پیش کرنے کی
غرض سے اس پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ مصحفیؔ لکھتے

ماں سے

صاحبِ خانہ تھا زبس (دکھ) غیور — دیکھ کر اس گلی میں یہ شر و شور
مشورت ہر کسی سے کرنے لگا — مارے غیرت کے سخت مرنے لگا
خشم گاہے کہے ماریں ڈال — جوں بنے اس بلا کو سر سے ٹال
لطف گاہے کہ تساہل کر — دیکھ ہوتا ہے کیا تامل کر
آخرِ کار تھے جو محرمِ کار — ایک دن ان کو جمع کر اک بار
مصلحت جو ہوا کہ کیا کیجے — کچھ مجھے اس کا مشورہ دیجے
کیونکہ سر سے ٹلے یہ رسوائی — تب انہوں نے یہ بات ٹھہرائی
یعنی اوباش کوچہ و بازار — کچھ نہ کچھ اس کو دیویں آزار
جب یہ ٹھہری تو کودکانِ شریر — ساتھ لے کر کے اپنے جمعِ کثیر
یک بیک اس جوان پر دھائے — لڑکے کیا آئے اک بلا لائے
سنگ ماری کسی نے اس پر کی — خاک باری کسی نے اس پہ کی
کوئی تلوار سے ڈرانے لگا — اس پہ برچھی کوئی اٹھانے لگا

ہاتھ کھینچا کسی نے اس کا بزور
کوئی غصے سے آیا بہ سرِ شور

ان واقعات کے اضافہ سے والدین کی ذہنی الجھن کا خاکہ کھینچنے

کی کوشش کی گئی ہے لیکن اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی مصحفی نے عاشق سے نجات پانے کے لئے لڑکی کے والدین کی طرف سے جن تدابیر کو عملی جامہ پہنایا ہے وہ معاشرتی ماحول کے مطابق نہیں ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے موقع پر والدین ذہنی اُلجھن میں مبتلا ہوئے ہوں گے! انہیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ عزیزوں اور دوستوں نے بھی مشورے مختلف قسم کے دیئے ہوں گے، لیکن عاشق کو برسرِ عام قتل کرا دینے اس کے پیچھے شرارت پسندوں کا گروہ لگا دینے اور طرح طرح کے آزار پہنچانے کے واقعات کچھ زیادہ قرینِ قیاس نہیں معلوم ہوتے۔ داستان میں جس بنا پر لڑکی کو والدین سے جُدا کیا جا رہا ہے وہ بڑا نازک موقع ہے۔ ہمارے معاشرے میں جب کسی لڑکی کے متعلق اس قسم کی خبر محلے میں اڑتی ہے تو ذہنی کوفت اور اُلجھن کے باوجود والدین بڑی خاموشی اور رازداری سے رسوائی اور بدنامی سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ حالات کی نزاکت کو سمجھتے ہیں اور رازداروں سے بھی اکثر تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔ انہیں تمام واقعات کا علم ہوتا ہے پھر بھی وہ لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ سانپ مارنے سے زیادہ لاٹھی بچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ اس لئے عاشق کی کھلم کھلا مخالفت اور اس کو سرِ راہ

اذیت پہنچانے کی کوشش والدین کی نفسیات کے منافی معلوم ہوتی ہے
یہ ضرور ہے کہ خاندان کے بعض افراد نے اس قسم کی رائے ضرور دی
ہوگی اور عاشق کا بُرا بھی چاہا ہوگا لیکن لڑکی کے والدین نے عاشق کو
بالاعلان آزار پہنچا کر اپنی رسوائی اور بدنامی کو طشت از بام کرنا پسند نہ
کیا ہوگا۔ اس لئے مصحفی کی تفصیلات اس سلسلے میں حُسنِ داستان نہیں
بلکہ داستان کا عیب بن گئی ہیں۔ میرؔ نے اس قسم کی بعید از قیاس باتوں کو
داستان میں جگہ نہیں دی۔ اس لئے ان کا بیان مصحفی کے مقابلہ میں زیادہ
فطری اور اثر انگیز ہے۔ اس موقع پر تفصیل کے بجائے اجمال اور افشائے
راز سے کہیں زیادہ اخفائے راز کی ضرورت تھی۔ میرؔ نے اس ضرورت
کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے لیکن مصحفی نے میرؔ کے بے رنگ خاکوں کا
رنگ کچھ اور گہرا رکھنے کی کوشش میں واقعات کی بعض تصویریں بگاڑ
دی ہیں۔

میرؔ نے بھی بعض واقعات کی تصویر کشی میں غیر معمولی اختصار سے
کام لیا ہے۔ اور تصویر کے ضروری خدوخال بھی نمایاں نہیں کئے ہیں مثلاً
میرؔ نے اپنی داستان میں لڑکی کو جس خاموش پس منظر میں والدین سے جُدا
کرکے دریا پار ایک قریبی عزیز کے یہاں بھیجا ہے وہ مشرق کی معاشرت

کے مطابق نہیں ہے۔ داستان میں جس لڑکی کا ذکر ہے وہ متوسط درجہ کے شریف گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ پردے میں پلی، بڑھی، پروان چڑھی ہے۔ اس کو بالغ ہو جانے کے بعد بھی کسی بڑی بوڑھی کا ساتھ لئے بغیر کسی قریبی عزیز یا بے تکلف دوستوں کے یہاں بھی جانے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ لڑکی خواہ کیسی ہی باشعور اور تیز طرار کیوں نہ ہو، والدین بالعموم جوان لڑکی کو خود اپنے گھر میں تنہا چھوڑنا یا دوسروں کے یہاں بھیجنا گوارا نہیں کرتے۔ ہماری معاشرت کا عملی پہلو بڑی حد تک آج بھی یہی ہے اور کنواری لڑکیاں اپنی ماں کا ساتھ لئے بغیر باہر نہیں نکلتیں۔ عام محفلوں یا تقریبوں میں بے تکلف آنے جانے کی انہیں اجازت نہیں ہوتی۔ وہ ضروری تقریبات میں اپنے قریبی عزیزوں کے یہاں جاتی ہیں لیکن بلا ضرورت قیام نہیں کرتیں۔ اگر کوئی لڑکی اس کے خلاف کرتی ہے یا اس کے والدین ان معاملات میں احتیاط نہیں برتتے تو چاروں طرف سے انگلیاں اٹھنے لگتی ہیں۔ لڑکی اور لڑکی کے والدین دونوں محلّے اور خاندان میں طعن و تشنیع کا مرکز بنتے ہیں۔ ایسی حالت میں والدین کا لڑکی کو اپنے ایک عزیز کے یہاں راتوں رات دایہ کے ساتھ بھیج دینا کوئی آسان مسئلہ نہ تھا۔

دریائے عشق" میں جس لڑکی کا ذکر کیا گیا ہے اوّل تو اُس کی نظر بازیوں کی خبر لوگوں کو ہو گئی ہے۔ عزیز و اقارب یوں بھی اصل واقعہ کو پانے کی فکر و جستجو میں لگے رہے ہوں گے بلکہ جوان لڑکی کو ناوقت یکایک گھر سے جدا کرنے میں عزیز و اقارب کے شبہات اور بڑھے ہوں گے۔ انہوں نے راتوں رات لڑکی کو دریا پر بھیجنے پر ضرور استعجاب کیا ہو گا۔ والدین سے اس کے متعلق طرح طرح کے سوالات کئے ہوں گے اور ان سوالات نے والدین کو بڑی اُلجھن میں ڈالا ہو گا۔ نفس واقعہ پر پردہ ڈالنے کے لئے والدین نے سوالات کے مفید مطلب جوابات تراشے ہوں گے۔ دوسروں کے ذہن سے کسی قسم کی بدگمانی یا شبہ کو دُور کرنے کی غرض سے حتی الوسع معقول اور قرین قیاس اسباب و علل سامنے لائے گئے ہوں گے۔ مختصر یہ کہ جوان لڑکی کو گھر سے الگ کرنا والدین کے لئے ایک بڑا اہم اور پیچیدہ مسئلہ تھا۔ اس کے سُلجھانے میں اُن کا ذہن مختلف قسم کی اُلجھنوں کا شکار ہوا ہو گا۔

لیکن میرؔ کے یہاں سارا پس منظر خاموش ہے۔ انہوں نے لڑکی کو آسانی سے رخصت کر دیا ہے۔ وہ مقتضائے حال کے منافی ہے انہوں نے اس موقع کی پوری تصویر اتارنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس

اہم پہلو کو سرسری واقعہ کے طور پر چند شعروں میں اس طور پر بیان کر دیا ہے ؎

جب ہوا ذکر اقلِ واکثر میں	چاہ ثابت ہوئی اُسے گھر میں
عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا	مضطرب کد خدائے خانہ ہوا
گھر میں جا کر بہر دفع رسوائی	بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی
یاں سے یہ غیرت مہ تاباں	جا کے چندے کہیں رہے پنہاں
شب محافے میں اس کو کر کے سوار	ساتھ دے ایک دایۂ غدّار

پار دریا کے جلد رخصت کی
اس طرح فکرِ رفعِ تہمت کی

میرؔ کا یہ بیان تشنہ ہے اور اس موقع کے قبل وبعد کے ان حالات پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جن سے والدین دو چار ہوئے ہوں گے۔ لیکن مصحفیؔ نے اس موقع کی تمام نزاکتوں اور محلّے والوں کے تجسّس و شبہات اور والدین کی ذہنی کیفیتوں کا پورا لحاظ رکھا ہے۔ متوسط درجہ کے مسلمان مشرقی گھرانوں میں ایسے موقعوں پر جو اُلجھنیں اور دشواریاں والدین کے سامنے آتی ہیں مصحفیؔ نے ان کو محسوس کر لیا ہے اور لڑکی کے رخصتی کے واقعہ کو تفصیل سے جیتے جاگتے پس منظر کے ساتھ

نظم کیا ہے اور اس مخصوص موقع پر ان کا یہ اضافہ عبدالماجد دریا آبادی کے لفظوں میں مصحفی کے کمال کی دلیل ہے۔[1]

لڑکی کو جدا کرنے کے جو اسباب مصحفی نے بیان کیے ہیں، وہ ضروری بھی ہیں اور قرین قیاس بھی۔ اوّل تو لڑکی ایک ایسے شخص کے یہاں بھجوائی گئی ہے جس سے لڑکی کے والدین صرف قرابت نہیں رکھتے بلکہ ایک جان دو قالب ہیں۔ والدین اُن پر ہر طرح اعتماد کر سکتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ لڑکی کو بیمار دکھایا گیا ہے۔ مسلسل آزار سے اس کی صحت ایسی خراب ہو گئی ہے کہ تبدیل آب و ہوا کے لئے اُس کا باہر بھیجنا ناگزیر ہو گیا ہے۔ یہ ایسے اسباب ہیں جو محلے والوں کا منہ بند کرنے کے لئے ضروری بھی ہیں اور مناسب بھی۔ مصحفی نے ان باتوں کے اضافے سے واقعہ کی تصویر کو میر کے مقابلے میں دلکش اور مکمل کر دیا ہے۔ میر کا بیان نظر سے گزر چکا ہے۔ اب مصحفی کا بیان دیکھئے ؎

جب نہ بن آئی اور کچھ تدبیر   یہی سوچے کہ اب بلا تاخیر

---

[1] دیباچہ بحر المحبت صفحہ ۳۱

یاں سے رے جا کے اس صنم کے تئیں
چند بے پوشیدہ رکھیں اور کہیں

طور پر اپنے واں یہ زیست کرے
پھر یہ لڑکا دہ یا جئے کہ مرے

پار دریا کے اک ٹھکانا نہ تھا
ان کا کوئی وہاں یگانہ نہ تھا

ان سے اور اُن سے تھی شناسائی
دوستی یک دلی اور یک جائی

اعتمادِ یگانگت بھی تھا
اتحادِ موانست بھی تھا

شاہدِ مہر جب ہوا رُو پوش
اور شب آئی ہو گلیم بدوش

اک محافہ میں کر سوار اُسے
ساتھ دایہ کے بھیجا پار اُسے

کہہ دیا یوں کہ ہاں یہ رشکِ بہار
ان دنوں رات دن رہے تھی نزار

خود بخود اُس کے دل پہ غم تھا کچھ
بے جہت مستقل الم تھا کچھ

دن کو بستر پہ زار رہتی تھی
شب کو اختر شمار رہتی تھی

خواب اور خور میں آگیا تھا قصور
اس کو تبدیل تھا مکان ضرور

اس لئے ہم نے اُس کو واں بھیجا
کہ بیاباں کی راس آئے ہوا

لیکن قسمت کی خوبی دیکھئے کہ اس پر بھی عاشق کو محبوبہ کے رخصت ہونے کی خبر ہو گئی اور جیسے ہی لڑکی کی ڈولی گھر سے نکلی عاشق بھی ساتھ ہو لیا۔

گھر سے باہر محافہ جو نکلا		اس جواں ہی کے پاس سے نکلا

(میرؔ)

کمر محافہ میں اس پری کو سوار		لے چلی جب وہ دایۂ مکّار

جوں ہی باہر وہ رہ گزر سے ہوا		گزر اس کا جواں کے سر سے ہوا

(مصحفیؔ)

اس موقع پر ہیرو کے جذباتِ عشق اور اُس کی والہانہ خودسپردگی و ربودگی کی تصویر میرؔ و مصحفیؔ دونوں کے یہاں بڑے قرینے سے کھینچی گئی ہے لیکن پھر بھی میرؔ کے بیان میں ندرت اور اثر زیادہ ہے۔ جو چیز مصحفیؔ کے یہاں دیدہ و شنیدہ ہے وہ میرؔ کے یہاں دیدہ و چشیدہ ہے۔ اس لئے عشق کے المیہ پہلوؤں کو بیان کرنے میں جو کامیابی میرؔ کو ہوئی ہے وہ مصحفیؔ کو نہیں ہوئی۔ زندگی کے بعض دوسرے پہلوؤں کی ترجمانی میں مصحفیؔ کا پلّہ میرؔ سے ہلکا نہیں ہے لیکن عشقیہ جذبات کی ترجمانی میں حقیقت یہ ہے کہ مصحفیؔ میرؔ تک نہیں پہنچ سکے۔ ہیرو کی گریہ وزاری و بیقراری کی تصویر میرؔ نے ان الفاظ میں کھینچی ہے ؎

رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے		اڑنے لاگے جگر کے پرکالے

دل کے غم کو زباں پر لایا		آفتِ تازہ جان پر لایا

کاۓ جفا پیشہ و تغافل کیش　　اک نظر سے زباں نہیں کچھ بیش
منہ چھپایا ہے تو نے اس پہ بھی　　نگہہ التفات ادھر بھی
ہے تو نزدیک دل سے اے طناز　　لیک تجھ تک سفر ہے دور دراز
ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے　　رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر
حال پر میرے ٹک تاسف کر

مصحفی عاشق کے شدتِ جذبات کو یوں نظم کرتے ہیں ۔

کر کے نالہ بہ طرح سوز و گداز　　یوں قرینِ محافہ دے آواز
کاے پری چہرہ اتنی روپوشی　　جی سے گزرا میں ہائے خاموشی
نہ تو آواز ہی سنائی ہے　　نہ تری بو ہی مجھ تک آتی ہے
خوبرو کرتے ہیں تغافل سب　　پر نہ اتنا کہ ہووے محض غضب
تجھ کو اپنی ستم گری کی قسم　　تجھ کو غمزے کی کافری کی قسم

حرف زن اپنے دردمند سے ہو
گرم اے آتش اس سپند سے ہو

ماہیرو کو مضطرب و بے قرار دیکھ کر "دایہ پُرفن" قریب آئی اور "وصل محبوب" سے شاد کام کرنے کے وعدے سے اس کی ڈھارس

بندھائی۔ عاشق بے چارہ اپنے ہوش میں نہ تھا۔ دایہ کی مکّاری کو نہ سمجھ سکا۔ دایہ کی باتوں کو سچ سمجھ کر اطمینان و سکون سے اُس کے ساتھ ہو لیا۔ لیکن دایہ بقول مصحفیؔ "استاد کارِ حیلہ وفن" تھی۔ عاشق سے چھٹکارا پانے کی صورتوں پر غور کرتی رہی۔ آخر کار اُسے ایک ترکیب سوجھی اور اُس نے عاشق کو دریا میں ڈبو دینے کا سامان کر لیا۔ چنانچہ محبوبہ کی کشتی بیچ دریا میں پہنچی تو دایہ نے محبوبہ کی جوتیاں دانستہ دریا میں پھینک دیں اور عاشق سے کہنے لگی کہ سچّے عاشق کے لئے یہ بڑی غیرت کی بات ہے کہ محبوبہ کی جوتیاں پانی میں بہہ جائیں اور وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا رہے۔ غرض مکّار دایہ نے عاشق کی رگِ حمیّت و غیرت کو کچھ ایسا بھڑکایا کہ وہ دریا میں کود پڑا۔ گرداب نے اُسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور پھر دریا کی تند و تیز لہریں اُسے اتنی دُور بہا لے گئیں کہ وہ کشتی پر واپس نہ آسکا۔ محبوبہ کو بھی اپنے عاشق سے سچّی محبّت تھی لیکن معاشرے کی سختیاں اور پابندیاں اُسے آنسو بہانے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ اس لئے وہ خاموشی سے غم کا گھونٹ اتار گئی۔ لیکن مکّار دایہ اپنی کامیابی پر بڑی خوش ہوئی اور اُس نے اپنی سمجھ میں عاشق و معشوق کو ہمیشہ کے لئے

ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔ دایہ کی اس مکارانہ چال اور عاشق کی معصومانہ جانبازی کا واقعہ میرؔ و مصحفیؔ دونوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نظم کیا ہے۔ میرؔ صاحب کہتے ہیں ؎

بیچ دریا کے دایہ نے جاکر | کفش اس گُل کی اُس کو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اک بار | اور بولی کہ او جگر افگار
حیف تیرے نگار کی پاپوش | موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش
غیرتِ عشق ہے تو لا اس کو | چھوڑیوں مت برہنہ پا اس کو
یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو | مفت ناموسِ عشق کو مت کھو
جی اگر تھا عزیز اے ناکام | کیوں عبث عشق کو کیا بدنام
سُن کے یہ حرف دایۂ مکار | دل سے اُس کے گیا شکیب و قرار
بے خبر کارِ عشق کی تہہ سے | جَست کی اُس نے اپنی جاگہ سے
تھا سفینہ ہی یا کہ دریا میں | موجِ زنجیر ہو گئی پا میں
کھنچ گیا قعر کو یہ گوہر ناب | تھی کشش عشق کی مگر تہ آب

عشق نے آہ کھو دیا اُس کو
آخر آخر ڈبو دیا اُس کو

مصحفیؔ نے اس واقعہ کو چندے اختصار کے ساتھ چند شعروں

میں یوں نظم کر دیا ہے ؎

پہنچی کشتی جو بیچ میں اک بار | ہوئی سرگرم حیلہ وہ غدّار
امتحاناً بروئے سطحِ آب | یعنی کفش اُس پری کی پر آب
تھا جو منظور اُس کو جاں لینا | پھر کہا یہ کہ ہاں میاں لینا
تھا جواں بسکہ سخت دلدادہ | ہو کے ناگہ بمرگ آمادہ
کفش پر کر دراز اپنا ہاتھ | آشنایانہ کُودا ہاں کے ساتھ
کودتے ہی چلا گیا تہہ کو | طے کیا عمقِ آب کی رہ کو

کودے ہر چند غوطہ خور اُس جا
نہ ملا آب سے نشاں اُس کا

مصحفیؔ کے ان اشعار کے متعلق مولانا عبدالماجد دریاآبادی تحریر فرماتے ہیں کہ :-

"مصحفیؔ نے اس موقع پر جو نکتۂ بلاغت مرعی رکھا ہے ؛ وہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے ۔ دریا میں جوتی پھینکنے کے بعد میرؔ صاحب نے دایہ کی زبان سے ایک پوری تقریر نقل کر دی ہے جو آٹھ شعروں میں آتی ہے اور جس میں طرح طرح کے واسطے دلا کر عاشق کو اس کے نکال لانے پر اُکسایا ہے

مصحفی نے اس ساری تقریر کے بجائے اس مفہوم کو صرف تین لفظوں میں ادا کر دیا ہے "ہاں میاں لینا"۔ بلاغت کے رمز شناس جانتے ہیں کہ یہ طریق ادا اس موقع کے لئے کتنا مناسب و مؤثر ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ مصحفی نے بڑے اختصار و بلاغت سے واقعہ کو نظم کر دیا ہے۔ آخری شعر تو خاص طور پر ایسا کہہ دیا ہے کہ اس موقع پر اس سے برجستہ اور مناسب فقرے کا تصور بھی مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن صرف اس بنا پر مصحفی کے بیان کو میر کے بیان پر ترجیح دینا مناسب نہیں ہے۔ شعر کے حسن یا فصاحت و بلاغت کا معیار محض اختصار نویسی سے متعین نہیں ہوتا۔ بعض جگہ اختصار حسن بن جاتا ہے اور بعض جگہ عیب اور بعض جگہ تفصیل بلاغت و فصاحت کا سبب ہوتی ہے۔ "سحر البیان" کا سب سے بڑا حسن یہی ہے کہ اس میں بیانات واضح اور مفصل ہیں لیکن یہ کہنا کہ اس کے اشعار بلیغ نہیں ہیں درست نہیں ہے۔ میر کا بیان توضیحی ہوتے ہوئے بھی معنی خیز، مؤثر اور حسین ہے۔ یہ تینوں چیزیں بلاغت و فصاحت پر دلالت کرتی ہیں۔ مصحفی کے بیان کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ پس منظر بالکل خاموش ہے۔ دایہ کو

مصحفی نے "استاد کار حیلہ و فن" — "غدار اور مکار" تو بتایا ہے لیکن ان کے قصے میں دایہ سے کوئی ایسا کام سرزد نہیں ہوتا جو اس کے کردار میں فعالیت و تحریک پیدا کر سکے۔ دایہ کا کردار کہانی کا اہم کردار ہے۔ اسی کے گرد سارا پلاٹ گردش کرتا ہے۔ ہیرو اور ہیروئن دونوں کے کرداروں اور کارناموں میں جاذبیت کے آثار دایہ کی مکاری کی بدولت ہی پیدا ہوتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ دایہ کی چالوں، ترکیبوں اور مکاریوں کو واضح کیا جاتا۔ میر نے یہی کیا ہے اور اس پُر فن شخصیت کو خود اس کے مکالمات سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصحفی نے بیان مختصر کر دیا ہے کہ دایہ کا کردار پس پشت پڑ جاتا ہے۔ اس لئے میرے خیال میں میر کا بیان کسی طرح مصحفی کے بیان سے کمتر درجہ کا نہیں ہے بلکہ داستانوی فن کے نقطۂ نظر سے اُن کا وضاحتی بیان مصحفی کے مختصر بیان سے زیادہ دلکش، جامع اور اثر انگیز ہے۔

ہیرو غرقاب ہو گیا اور دایہ لڑکی کو لے کر دنیا پار پہنچ گئی۔ لیکن اس کی مکاری عشق کی کرشمہ سازیوں کا مقابلہ نہ کر سکی۔ لڑکی نے ایک ہی ہفتہ کے بعد گھر واپس ہونے کی خواہش ظاہر کی اور اس کے لئے

کچھ اس قسم کے اندازِ معصومانہ اور تجاہل عارفانہ سے کام لیا کہ دایہ اپنی پر رضامند ہو گئی۔ مصحفی کا بیان ہے کہ :-

ایک دن دایہ سے کہا آ کر مجھ کو اکثر ہے دردِ جگر
یہ مکاں بھی نہ سازوار ہوا دل مرا یاں بھی بے قرار ہوا
گھر کو لے چل کہ جس کا خطرہ تھا اب تو وہ مدّعی جہاں نہ رہا
ساری اس کے سبب سے تھی آفت وہ نہیں اب تو کیا ہے پھر ہیبت
کوئی اب اس کا دادخواہ نہیں اس کی باتیں اسی کے ساتھ گئیں
کون جانے کہ وہ کدھر کو گیا
مر گیا یا کسی نگر کو گیا

لیکن مصحفی کے بیان میں حسن و زور نہیں ہے۔ اس موقع کی تصویر میر کے ہاں زیادہ شدید اور پُر اثر لب و لہجہ میں کھینچی گئی ہے۔ ان کے یہاں لڑکی کے منہ سے کچھ ایسی باتیں کہلوائی گئی ہیں جو اس موقع کے لئے ضروری تھیں اور جن کے بغیر دایہ واپسی پر رضامند ہی نہ ہو سکتی تھی۔ لڑکی نے کچھ ایسے فقرے ادا کئے ہیں گویا اُسے واقعی ہیرو کے ڈوب جانے سے خوشی نصیب ہوئی ہے۔ کوئی اس بات کا گمان تک نہیں کر سکتا کہ لڑکی عشق کی آگ میں جل رہی ہے۔ حالانکہ لڑکی کو عاشق کی

جدائی کچھ ایسی شاک ہے کہ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتی ہے اور موت کا بہانہ تلاش کرتی ہے لیکن اس نے کچھ ایسے ضبط و تحمل اور تجاہل عارفانہ سے کام لیا کہ دایہ ذرا بھی لڑکی کے منشا کو نہ پا سکی۔ چنانچہ میر صاحب بیان کرتے ہیں کہ ؎

قصہ کوتاہ بعد ایک ہفتہ — آئی وہ رشکِ مہ ز خود رفتہ
کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ — ہو گیا غرق وہ فرومایہ
اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا — آرزومند اس جہاں سے گیا
تھے جو ہنگامے اس کے حد سے زیاد — ساتھ اس کے گئے وہ شور و فساد

شور فتنے تھے اس تلک سارے
اب تو بدنامیاں نہیں بارے

آخر کار دایہ چکمہ کھا گئی اور لڑکی کو کشتی میں لے کر روانہ ہو گئی اور میر کے لفظوں میں ؎

یوں نہ سوچی کہ بد بلا ہے عشق
گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق

جب کشتی بیچ دریا میں پہنچی تو لڑکی نے انجان بن کر بھولے بھالے انداز میں دایہ سے پوچھا کہ آتے وقت میری جوتی دریا میں کس جگہ گری

تھی اور وہ فتنہ طراز کس مقام پر ڈوبا تھا؟ اس قسم کی باتوں سے گویا لڑکی نے دایہ کے کارنامہ کی داستان دہرا دی۔ چنانچہ دایہ لڑکی کے سوالات سے بہت خوش ہوئی اور جس جگہ یہ واقعہ رونما ہوا تھا اشارے سے لڑکی کو بتا دیا۔ لڑکی یہی چاہتی تھی۔ وہ اچانک دریا میں چھلانگ لگا گئی اور تند و تیز موجوں نے اُسے ذرا دیر میں نظر سے اوجھل کر دیا۔ اس واقعہ کے ساتھ ساتھ دایہ اور لڑکی کی باہمی گفتگو مصحفی و میرؔ دونوں نے بڑی خوش اسلوبی سے نظم کی ہے۔ پہلے میرؔ کا بیان دیکھئے ؎

حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی   دایہ کشتی میں لے سوار ہوئی
حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ   یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش   تھا تلاطم سے کس طرف ہمدوش
مجھ کو دیجو نشانِ جا اُس کا   میں بھی دیکھوں شورش دریا کا
ہوں میں ناآشنائے سیرِ آب   ناشناسائے موجہ و گرداب
یاں میسّر کہاں بہ سیرِ عبور   اتفاقی ہیں اس طرح کے امور
مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل   لیک تہ سے سخن کے تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق   ہے یہ مہ پارہ ناشکیب عشق

پہنچ دریا کے جا کہا یہ حرف		یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف

سُنتے ہی یہ کہاں کہاں کہہ کر
گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کر کر

میرؔ کا یہ بیان بڑا مکمل ہے۔ انہوں نے دایہ کو لڑکی کے اصل منشاء سے بے خبر رکھنے کا پورا التزام کیا ہے۔ لڑکی سے ایسی باتیں کہلوائی ہیں جو قرینِ قیاس ہیں اور جن کی تہہ تک عام آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ حتیٰ کہ مکار دایہ بھی لڑکی کی معصومانہ گفتگو کا شکار ہو گئی۔ مصحفیؔ نے اس واقعہ کو خاموش ماحول میں نظم کیا ہے۔ لڑکی اور دایہ کا جو مکالمہ اُن کے یہاں ملتا ہے وہ میرؔ کی طرح جاندار نہیں ہے بلکہ بعض باتیں ایسی ہیں جن کا اظہار کرنا لڑکی کے لئے قطعی نامناسب تھا مصحفیؔ لکھتے ہیں ؎

ہوئی کشتی پہ جب محافہ سوار		دایہ اس کی جو تھی امانت دار
اُس سے پوچھا کہ دایہ سچ بتلا		کس مکاں پہ وہ خستہ ڈوبا تھا
کفش پھینکی تھی تو نے کس جاگہ		مجھ کو لے چل ذرا تو اس جاگہ
کفش پر میرے جی دیا اُس نے		یا الٰہی یہ کیا کیا اُس نے
یہ ترنگ اُس کے جی میں کیا آئی		کہیں ہوتے ہیں ایسے سودائی
کفش میں ایسی کیا کرامت تھی		کفش والی تو میں سلامت تھی

اُس کی نادانی جی کھپاتی ہے   اب کوئی دم میں جان جاتی ہے

آخری چار اشعار میں مصحفی نے لڑکی کے منہ سے جو کچھ کہلوایا ہے وہ مقتضائے حال کے مطابق نہیں ہے۔ لڑکی نے ان اشعار میں جس قسم کا اظہار خیال کیا ہے اس سے تو محبت کا سارا راز فاش ہو جاتا ہے۔ لڑکی کا یہ سب کچھ کہہ دینے کے بعد بھی دایہ کا غافل رہنا اور اس کے منشا کو نہ پانا حیرت انگیز ہے۔ لیکن آخر مصحفی نے بھی پس منظر کو جاندار بنانے کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

پھر بدل کر زباں بناز و ادا   بولی وہ ناز نیں ہوا سو ہوا
دایہ موجوں کا پیچ و تاب تو دیکھ   اور یہ زنجیرۂ حباب تو دیکھ
دل کشا سطح آب کی ہے فضا   سرد لگتی ہے کیا ہی جی کو ہوا
کاش کشتی کھڑی کریں کوئی دم   تا نکالوں میں اپنے جی کا غم
دایہ غافل تھی از ادائے کلام   ہنس کے کہنے لگی کہ سیم اندام
دیکھ لے اس جگہ وہ ڈوبا تھا   میں یہیں کفش تیری پھینکا تھا
سنتے ہی یہ سخن وہ پا بر کاب   گر پڑی اس جگہ پہ جوں سیماب

یہاں چوتھا شعر موقع محل کے اعتبار سے مناسب نہیں ہے۔ اس شعر میں جو کچھ کہا گیا ہے اس میں رونما ہونے والے واقعہ کی پیش گوئی

نظر آتی ہے۔ تعجب ہے کہ دایہ اپنی تمام ہوشیاری و مکاری کے باوجود لڑکی کے مافی الضمیر کو نہ بھانپ سکی۔ اس کے علاوہ لڑکی جس اطمینان سے کشتی کو رکواتی ہے اور دایہ جس باقاعدگی سے لڑکی کو دریا کا مشاہدہ کرواتی ہے وہ بھی برجستہ اور فطری انداز کی چیزیں نہیں معلوم ہوتیں۔ اس کے برعکس میر کا بیان اگرچہ مختصر ہے لیکن موقع محل کی مناسبت، برجستگی اور اقتضائے فطری کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ میر کے یہ دو شعر

بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف   یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کر   گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کر کر

جس بلاغت و آسانی سے حادثے کی تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ وہ مصحفی کے مفصل بیان میں نہیں ہے۔ ان شعروں میں دایہ کا دریا کی طرف اشارہ کرنا اور لڑکی کا روا روی میں ترکِ جاں کر کے دریا میں کود پڑنا عام طور پر رونما ہونے والے واقعات سے مطابقت رکھتا ہے۔ دوسرا شعر خاص طور پر بہت برجستہ اور معنی خیز ہے۔ "کہاں، کہاں" کے ٹکڑے نے خیالی تصویر کو مجسم بنا کر پیش کر دیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا واقعہ سامعین و قارئین کے سامنے رونما ہو رہا ہے۔ اس کے برعکس مصحفی کے طرزِ فکر اور اندازِ بیان پر تضاد و تصنع کا گمان ہوتا

ہے۔ مصحفی نے اس موقع کی جو تصویر کھینچی ہے صرف یہی نہیں کہ اس کا رنگ ہلکا ہے یا اُس کے خطوط و نقوش مدھم ہیں بلکہ اس میں داستان کی بعض کمزوریاں بھی ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ میر کے مقابلے کی جیتی جاگتی تصویر نہ پیش کر سکے۔

اس حادثہ کے بعد دایہ تنہا گھر واپس پہنچی۔ والدین کو المناک واقعہ کی خبر دی۔ ماں باپ کے ہوش اڑ گئے۔ روتے پیٹتے دریا کے کنارے پہنچے۔ دوسروں کو بھی خبر پہنچی اور ذرا دیر میں تماشائیوں کا ہجوم لگ گیا۔ لڑکی کی لاش تلاش کی جانے لگی۔ دریا میں جال ڈال دیئے گئے اور آخر کار لاش ہاتھ آ گئی۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہوئی کہ ہیرو، ہیروئن دونوں کی لاشیں باہم پیوستہ برآمد ہوئیں۔ لوگ استعجاب میں تھے۔ لاشوں کو الگ کرنے کی تدبیریں کی گئیں لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار دونوں کو ایک ساتھ دفن کر دیا گیا۔ یہ آخری واقعہ جس میں والدین کا غم، دایہ کی اُلجھنیں، تماشائیوں کی حیرانی اور عشق کی کرشمہ سازیوں کا ذکر ہے مصحفی کے مقابلے میں میر کے ہاں زیادہ جامع اثر انگیز اور پُر زور الفاظ میں نظم ہوا ہے۔ میر صاحب لکھتے ہیں ؎

سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ　　　آفت اک ساتھ لے گئی دایہ

اب و عم مادر و برادر سب — خاک افشاں بسر و نالہ بلب
دام داروں سے سب نے کام لیا — آخر ان کو اسیرِ دام کیا
نکلے باہم وے موئے نکلے — دونوں دست و بغل ہوئے نکلے
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں — ایک کے لب سے ایک کو تسکیں

جو نظر ان کو آن کرتے تھے
ایک غالب گمان کرتے تھے

اسی کے ساتھ مصحفی کے اشعار دیکھئے

دایہ مایوس واں سے گھر آئی — کہتے یہ حرف ہائے رسوائی
پدر و مادر اور ہمسائے — لب دریا پہ سر زناں آئے
اشک ریزاں کوئی کوئی نالاں — کوئی خاکِ سیاہ بر سر مالا
کوئی داماں تلک گریباں چاک — کوئی حیران بازیِ افلاک
لبِ ساحل پہ ازدحام ہوا — اتنے میں جو تلاش دام ہوا
دو بہم آغوش دام میں نکلے — پکے اپنے وہ کام میں نکلے
لب سے لب آشنائے بوسہ بذوق — ہاتھ دونوں کے دو گلوں کے طوق
ساقِ پا ساقِ پا سے پیچیدہ — یک دگر عضو عضو گرویدہ
سینہ سینے کے ساتھ شیر و شکر — جن میں خالی ذرا نہ جائے نظر

نظر آئے وہ دونوں ماہ منیر جیسے اک آئینے کی دو تصویر
دیکھ اس واقعہ کو پیر و جواں دیر تک واں کھڑے رہے حیراں
تھی جدائی زبس بہم دشوار سب نے ناچار ہو کے آخر کار

خاک میں یا ملا دیا اُس کو
آگ میں یا جلا دیا اُس کو

میرؔ و مصحفیؔ دونوں کے اشعار ساتھ ساتھ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ میرؔ نے والدین کے جذباتِ غم کا اظہار مصحفیؔ کے مقابلے میں زیادہ فطری اور برجستہ انداز میں کیا ہے۔ مصحفیؔ نے ہیرو اور ہیروئن کی لاشوں کو باہم پیوست دکھانے کے لئے تین چار شعروں میں جو تفصیلات دی ہیں وہ غیر ضروری ہیں۔ اس لئے حُسنِ بیان میں کوئی اضافہ نہیں کرتیں۔ اس کے برعکس میرؔ نے انتہائی سادگی اور بے ساختگی کے ساتھ لاشوں کی پیوستگی کا منظر صرف ایک شعر میں یوں پیش کر دیا ہے ؎

نکلے باہم وے موئے نکلے دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

میرؔ نے داستان کا خاتمہ بھی سلیقہ سے کیا ہے وہ اپنے آخری اشعار میں لاشوں کی پیوستگی کی مدد سے ہیرو ہیروئن کو ایک جان دو قالب

کہہ کر قصّے کو ختم کر دیتے ہیں۔ ان کی تجہیز و تکفین کا مسئلہ نہیں چھیڑتے گویا انہوں نے سچی محبّت اور اس کی کرشمہ سازیوں کی ایک مختصر کہانی بیان کی ہے۔ انہیں اس سے سروکار نہیں ہے کہ محبّت کرنے والے کس قوم اور کس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مصحفیؔ اپنا قصّہ اس شعر پر ختم کرتے ہیں ؎

خاک میں یا ملا دیا اُن کو　　آگ میں یا جلا دیا اُن کو

مصحفیؔ سے اس جگہ ایک بنیادی غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے اس بات کا لحاظ نہیں رکھا کہ ان کے آخری شعر سے پورے قصّے کی واقعیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ ان کا یہ شعر اس بات کی واضح شہادت دیتا ہے کہ انہیں اصل قصّہ اور اُس کے کرداروں کی پوری خبر نہیں ہے اس لئے انہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ لاشیں کن کی تھیں اور ان کا کیا حشر ہوا، آیا وہ جلا دی گئیں یا دفن کر دی گئیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سامع یا قاری پوری داستان کو فرضی خیال کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ داستان کا حُسن یہ ہے کہ وہ فرضی نہ معلوم ہو۔ کہانی یکسر خیالی اور گھڑی ہوئی کیوں نہ ہو لیکن اس طور پر پیش کرنی چاہیئے کہ سننے والے اسے تاریخی یا نیم تاریخی واقعہ خیال کریں۔ جب تک قاری یا سامع کے ذہن میں

اس قسم کا تیقن پیدا نہ ہو وہ قصّے کو صبر و ضبط اور دلچسپی یا اہمیت کے ساتھ سننا پسند نہ کرے گا۔ مصحفی نے آخری شعر کہہ کر کہانی کے اس اہم پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے۔ نتیجتاً مصحفی کے قصّے کے آغاز کی طرح اس کا اختتام بھی میرؔ کے مقابلے میں کمزور اور پھیکا ہے۔

مذکورہ بالا تصریحات و توضیحات کے بعد اگر ہم دونوں منظوم قصوں کے حُسن و قبح کو ذہن میں رکھ کر ان کے مراتب کا تعین کرنا چاہیں تو کئی وجوہ سے میرؔ کی "دریائے عشق" کو مصحفی کی "بحر المحبّت" پر ترجیح دینی پڑے گی لیکن عبدالماجد دریا آبادی نے "بحر المحبت" کے دیباچے میں بحر المحبّت کو دریائے عشق سے برتر و بہتر ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اس میں صرف مولوی عبدالماجد صاحب قصور وار نہیں ہیں، بلکہ ہمارے ہاں رواج سا ہو گیا ہے کہ جب کوئی غیر مطبوعہ دیوان یا کلام کسی کے ہاتھ لگتا ہے تو اس کی اشاعت و ترویج میں خاص اہتمام سے کام لیا جاتا ہے۔ عموماً نئی دریافت کو اہم بنانے کے لئے بعض غیر ضروری باتوں پر اس قدر زور دیا جاتا ہے کہ مفید تنقید نگاری کا حق ادا نہیں ہوتا۔ کسی قدیم غیر مطبوعہ نظم، غزل یا مثنوی کا سامنے آجانا تاریخی نقطہ نظر سے یقیناً کسی حد تک مفید ہے۔ اس سے تاریخِ

ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اس اضافے کو تنقید کی کسوٹی پر کسنا ضروری ہے۔

پروفیسر کلیم الدین احمد نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:-

"محقق کی راہ میں ایک مقام آتا ہے اور اگر وہ ہوشیاری سے کام نہیں لیتا تو اس مقام میں پھنس جاتا ہے۔ محقق کامل محنت و جستجو، دماغ سوزی اور صرفہ وقت کے ساتھ کسی چیز کی تحقیق کرتا ہے یا کسی گمشدہ تصنیف کا سراغ لگاتا ہے تو وہ اس کامیابی سے فطری طور پر مسرور ہوتا ہے اور اپنی مسرت میں صحیح معیار تنقید کو فراموش کر دیتا ہے یعنی جو شے کامل جستجو کے بعد پاتا ہے اس کی صحیح اہمیت اصل قدر و قیمت کا اندازہ کرنے میں ناکامیاب ہوتا ہے۔"

بالکل اسی طرح کا واقعہ مولوی عبدالماجد دریا آبادی کے ساتھ پیش آیا ہے۔ انہوں نے اپنی دریافت و تحقیق کو اہم بنانے کی کوشش میں تنقید

لے اردو تنقید پر ایک نظر صفحہ ۱۱۴ دوسرا ایڈیشن مطبوعہ برقی پریس مراد پور۔ پٹنہ۔

کا صحیح حق ادا نہیں کیا ورنہ وہ دریائے عشق پر بحر المحبت کو کبھی ترجیح نہ دیتے۔ خود مصحفی کو اس امر کا یقین معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مثنوی دریائے عشق کی ٹکر کی نہیں ہے۔ بحر المحبت کے آغاز میں انہوں نے دریائے عشق کے قصے میں بعض جگہ مزید رنگ بھرنے کا دعوی کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض جگہ وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں لیکن آخر وہ سمجھ گئے انہیں مجموعی حیثیت سے کامیابی نہیں ہوئی اور ان کا قصہ میر کے قصے سے بہتر نہیں ہے۔ چنانچہ مثنوی کے اختتام پر خود لکھتے ہیں ؎

مصحفی بس زباں درازی بس　　آخرش ہے مقام ضبطِ نفس
مجھ سے یہ مثنوی ہوئی جو تمام　　رکھا بحر المحبت اس کا نام
قصہ ہے ایک اور دو نامے　　جیسے اک شخص کے ہوں دو جامے
میر صاحب نے پہلے نظم کیا　　میں نے بعد اس کے ریزہ ریزہ کیا
ہے توقع کہ صاحبِ انصاف　　مجھ کو اس گفتگو میں رکھیں معاف

کچھ مرے حق میں خیر و شر نہ کہیں
نہ کہیں بد بھی نیک گر نہ کہیں

مصحفی نے اپنے متعلق بہت صحیح رائے دی ہے۔ اگر ہم ان کی گزارش کا پاس رکھیں تو زیادہ سے زیادہ بحر المحبت کے متعلق صرف

اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ وہ دریائے عشق کے مقابلے میں اتنی بری نہیں ہے کہ اس کے سامنے نہ لائی جا سکے لیکن مولوی عبدالماجد دریاآبادی کا یہ قیاس کہ "نقش ثانی نقش اوّل کے مقابلے میں آسان تر اور بہتر ہوتا ہے" یا "مصحفی کی مصوّری مقتضائے حال سے قریب تر اور جذبات بشری کے زیادہ مطابق ثابت ہوئی" درست نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے کہ دنیائے ادب میں نقش ثانی اکثر نقش اوّل کی تازگی، جدّت اور اصلیت سے محروم ہی رہتا ہے۔ یہ رائے صرف میری نہیں ہے بلکہ جن حضرات نے بھی دریائے عشق" اور بحر المحبّت دونوں کو سامنے رکھ کر میرؔ اور مصحفیؔ کی مثنوی نگاری کا جائزہ لیا ہے، اُن میں سے ہر ایک نے شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے دریائے عشق" کو بحر المحبّت سے بہتر ٹھہرایا ہے چنانچہ پروفیسر عبدالقادر سروری لکھتے ہیں کہ:-

"مصحفیؔ کی مثنوی بحر المحبّت کا قصّہ میرؔ کی مثنوی دریائے عشق سے ماخذ ہے۔ اس قصّے کو لینے کا مقصد ظاہر ہے کہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ اس کو بڑھا چڑھا کر سحر البیان کے درجہ تک پہنچا یا جائے لیکن وہ اپنی کوششوں اور موشگافیوں کے باوجود میرؔ تک نہ پہنچ سکے[۵]"

۵ اُردو مثنوی کا ارتقاء صفحہ ۱۱۲

نثار احمد فاروقی کا خیال ہے کہ :-

"اگر میرے سامنے دریائے عشق اور بحر المحبت انتخاب کے لئے رکھی جائیں اور معاملہ میری ذات پر چھوڑ دیا جائے تو دریائے عشق ہی کو ترجیح دوں گا"[1]

امیر احمد علی علوی رقم طراز ہیں کہ :-

"مصحفی نے ایک مثنوی بحر المحبت نام میر تقی میر کی دریائے عشق کے جواب میں لکھی ہے۔ وہی قصہ ہے، وہی بحر ہے لیکن وہ درد نہیں"[2]

کم و بیش اسی قسم کی رائیں دوسرے ناقدین نے ظاہر کی ہیں۔ ایسی صورت میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی صاحب کا یہ کہنا کہ "مصحفی کا پلہ جھکتا نظر آتا ہے" کس حد تک درست ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین آسانی سے کر سکتے ہیں۔

---

[1] دلی کالج میگزین (میر تقی میر نمبر) ص ۳۱۱

[2] نگار اردو شاعری نمبر ۱۹۳۵ء

مثنوی دریائے عشق

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال — ہر جگہ اس کی اک نئی ہے چال
دل میں جا کر کہیں تو درد ہوا — کہیں سینے میں آہِ سرد ہوا
کہیں آنکھوں میں خون ہو کے بہا — کہیں سر میں جنون ہو کے رہا
کہیں رونا ہوا ندامت کا — کہیں ہنسنا ہوا جراحت کا
گہ نمک اس کو داغ کا پایا — گہ پتنگا چراغ کا پایا
واں طپیدن ہوا جگر کے بیچ — یاں تبسّم ہے زخم تر کے بیچ
کہیں آنسو کی یہ سرایت ہے — کہیں یہ خوں چکاں حکایت ہے
تھا کسو دل میں نالۂ جانکاہ — ہے کسو لب پہ ناتواں اک آہ
تھا کسو کی پلک کی نمناکی — ہے کسو خاطروں کی غمناکی
کہیں باعث ہے دل کی تنگی کا — کہیں موجب شکستہ رنگی کا

کہیں اندوہ جانِ آگہ تھا
سوزشِ سینہ ایک جاگہ تھا

کہیں عشاق کی نیاز ہوا
کہیں اندوہِ جاں گداز ہوا

ہے کہیں دل جگر کی بیتابی
تھا کسو مضطرب کی بے خوابی

کسو چہرہ کا رنگ زرد ہوا
کسو محمل کی رہ کی گرد ہوا

طور پر جا کے شعلہ پیشہ رہا
بے ستوں میں شرارِ تیشہ رہا

کہیں نے کو بہت لگائی آگ
کہیں تیغ گلو میں رکھی لاگ

کبھو امغانِ مرغِ گلشن تھا
کبھو قمری کا طوقِ گردن تھا

کسو مطبخ میں جا قنارہ ہوا
کوئی دل ہو کے پارہ پارہ ہوا

ایک عالم میں دردمندی کی
ایک محفل میں جا سپندی کی

ایک دل سے اٹھے ہے ہو کر دود
ایک لب پر سخن ہے خوں آلود

اک زمانے میں دل کی خواہش تھا
اک سمے میں جگر کی خواہش تھا

کہیں بیٹھے ہے جی میں ہو کر چاہ
کہیں رہتا ہے قتل تک ہمراہ

خارِ خارِ دلِ عزیزاں ہے
انتظارِ بلا نصیباں ہے

کہیں شیون ہے اہلِ ماتم کا
کہیں نوحہ ہے جانِ پُر غم کا

آرزو تھا امیدواروں کی
دردمندی جگر فگاروں کی

نمک زخمِ سینہ ریشاں ہے
نگہِ یاس مہر کیشاں ہے

حسرت آلودہ آہ تھا یہ کہیں — شوق کی یک نگاہ تھا یہ کہیں
کشش اس کی ہے ایک اعجوبا — ڈوبا عاشق تو یار بھی ڈوبا
کون محروم وصل یاں سے گیا — کہ نہ یار اس کا پھر جہاں سے گیا
کام ہیں اپنے عشق پکا ہے — ہاں یہ نیرنگ ساز پکا ہے
جس کو ہو اس کا التفات نصیب — ہے وہ مہمانِ چند روزہ غریب

ایسی تقریب ڈھونڈ لاتا ہے
کہ وہ ناچار جی سے جاتا ہے

آغاز قصہ جاں گداز کا

ایک جا اک جوانِ رعنا تھا — لالہ رخسار و سرو بالا تھا
عشق رکھتا تھا اس کی چھاتی گرم — دل وہ رکھتا تھا موم سے بھی نرم
شوق تھا اس کو صورتِ خوش سے — اُنس رکھتا تھا وضع دلکش سے
تھا طرحدار آپ بھی لیکن — رہ نہ سکتا تھا اچھی صورت بن
کوئی ترکیب اگر نظر آتی — صورتِ حال اور ہو جاتی
دیکھتا گر وہ کوئی خوش پرکار — رہتا خمیازہ کش ہی لیل و نہار

زلف ہوتی کسو کی گر برہم | دیکھتے اُس کے حال کو درہم
دیکھتا گر کہیں وہ چشم سیاہ | دل سے بے اختیار کرتا آہ
سر میں تھا شور، شوق دل میں تھا | عشق ہی اُس کے آب و گل میں تھا

الغرض وہ جوانِ خوش اسلوب
ناشکیبا رہے تھا بے محبوب

ایک دن بے کلی سے گھبرایا | سیر کرنے کو باغ میں آیا
کسو گُل پاس وہ صنم ٹھہرا | کہیں سبزے میں ایک دم ٹھہرا
اک خیاباں میں سے ہو نکلا | ایک سایہ تلے سے رو نکلا
نہ تسلی ہوا دلِ بے تاب | نہ تھما چشمِ تر سے خونِ ناب
دل کی واشد سے بے توقع ہو | ہر شجر کے تلے بہت سا رو
دیکھ گلشن کو ناامیدانہ | منہ کیا اُس نے جانبِ خانہ
دل کے رُکنے کا اس کو اک غم تھا | راہ چلنے میں خیال درہم تھا
ناگہ اس کوچہ سے گذار ہوا | آفتِ تازہ سے دوچار ہوا
ایک غرفہ سے ایک مہ پارہ | تھی طرف اُس کے گرمِ نظارہ
پڑ گئی اُس پہ اِک نظر اُس کی | پھر نہ آئی اُسے خبر اُس کی
تھی نظر یا کہ جی کی آفت تھی | وہ نظر ہی وداعِ طاقت تھی

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ
صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

بے قراری نے کچھ ادائی کی
تاب و طاقت نے بے وفائی کی

منہ جو اُس کا طرف سے اُس کے پھرا
مضطرب ہو کے خاک پر یہ گرا

وہ تو رکھتی نہ تھی خیال اس کا
بے طرح ہووے گو کہ حال اس کا

جھاڑ دامن کے تیئں وہ مہ پارہ
اُٹھ گئی سامنے سے یک بارہ

وہ گئی اس کے سر بلا آئی
خاک میں مل گئی وہ رعنائی

دل پہ کرنے لگا تپیدن ناز
رنگ چہرے سے کر چلا پرواز

ہاتھ جانے لگا گریباں تک
چاک کے پھیلے پاؤں داماں تک

طبع نے ایک جنوں کیا پیدا
اشک نے رنگ خوں کیا پیدا

سوزشِ دل نے جی میں جا گہ کی
داغ نے آہ جگر کو آتش دی

بسترِ خاک پر گرا وہ زار
درد کا گھر ہوا دلِ بیمار

خاطر افگارِ خار خار ہوئی
جاں تمنا کشِ نگار ہوئی

اُس کے منہ پر پڑی جو اُس کی نگاہ
ناامیدی کے ساتھ ہی کی آہ

خو ہوئی نالۂ حزیں کے ساتھ
رابطہ آہِ آتشیں کے ساتھ

ہونٹ سوکھے تو خونِ ناب ملا
خواب و خور دونوں کو جواب ملا

خلق اس کی ہوئی تماشائی
پر نہ وہ دیکھنے کبھو آئی

کچھ کہا گر کسو نے شفقت سے — رو دیا اُن نے ایک حسرت سے
جا کے اُس کے قریبِ در بیٹھا — قصد مرنے کا اپنے کر بیٹھا
دل نہ سمجھا کہ اضطراب کیا — شوق نے کام کو خراب کیا
جو کہ سمجھے تھے اس کو دیوانہ — رحم کرتے تھے آشنا بیگانہ

عاشق اس کو کسی کا جان گئے
سب بُرا اس ادا کو مان گئے

کیونکہ باہم معاش تھی سب کی — ایک جا بود و باش تھی سب کی
وارث اس کے بھی بدگمان ہوئے — درپئے دشمنیٔ جان ہوئے
مشورت تھی کہ مار ہی ڈالیں — دفعتاً اس بلا کے تئیں ٹالیں
پھر یہ ٹھہری کہ ہوں گے ہم بدنام — سن کے آخر کہیں گے خاص و عام
کیا گنہ تھا کہ یہ جواں مارا — کن نے مارا اسے کہاں مارا
ہو ڈرے یہ خونِ خفتہ گر بیدار — کھینچنی ہووے خفتِ بسیار
کیجے ایک ڈھب سے اس کو تنگ — تا نہ عائد ہو اپنی جانب ننگ
تہمتِ خبط رکھئے اس کے سر — کیجے سنگ سار اس کو پھر
دے کے دیوانہ اس جواں کو قرار — ہو گئے سارے درپئے آزار
ایک نے سخت کہہ کے تنگ کیا — ایک نے آ کے زیرِ سنگ کیا

ایک آیا تو ہاتھ میں شمشیر   ایک بولا کہ اب ہے کیا تاخیر
کی اشارت کہ کودکانِ شہر   آئے لبریزِ غصّہ و پُر قہر

گرچہ ہنگامہ اُس کے سر پر تھا
لیک روئے دل اُس کا اودھر تھا

محو تھا اس کے یہ خیال کے بیچ   تھا گرفتار اپنے حال کے بیچ
ہونٹھ پر حسن کا بیاں اس کا   تھا سر و سنگ آستاں اُس کا
ایک دم آہِ سرد بھر اٹھتا   نالۂ گرم گاہ کر اُٹھتا
جی میں کہتا کہ آہ مشکل ہے   اس طرف یک نگاہ مشکل ہے
دوست کو میرے نام سے ہے ننگ   دشمنوں سے ہے جی پہ عرصہ تنگ
چشمِ تر سے لہو بہا کرتا   صبح کی باد سے کہا کرتا
کائے نسیم سحر یہ اس سے کہہ   مت تغافل کر اور غافل رہ
ان بلاؤں میں کوئی کیونکہ جیے   جان پر آ بنی ہے تیرے لئے
جان دوں تیرے واسطے سو تو   آنکھ اٹھا کر ادھر نہ دیکھے کبھو
رفتہ رفتہ ہوا ہوں سودائی   دُور پہنچی ہے میری رسوائی
نام کو بھی ترے نہ جانا آہ   تجھ سے کیونکہ سخن کی نکلے راہ
ناامیدانہ گر کروں ہوں نگاہ   دیکھتا ہوں ہزار روزِ سیاہ

سخت مشکل ہے سخت ہے بیداد — ایک میں خوں گرفتہ سو جلاد
کوئی مشفق نہیں کہ ہووے شفیق — بے کسی بن کوئی نہیں ہے رفیق
نالہ ہوتا ہے گہ گہے دلجو — گریہ آنسو سے پوچھتا ہے کبھو
آہ جو ہمدمی سی کرتی ہے — اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے
چشم رکھتا ہے وصل کی یہ دل — جی ہے اس سے اسیرِ آب و گل
ورنہ ترکیب یہ کہاں ہوتی — صورت اک معنیٔ نہاں ہوتی
اب ٹھہرتا نہیں ہے پائے ثبات — ایک میں اور کتنی تصدیعات
سنگ باراں سے سخت ہوئی تنگ — شیشۂ دل نہیں ہے پارۂ سنگ
محرمِ یک نگاہ بیش نہیں — کم ہے سینہ میں جا کہ ریش نہیں
کیونکہ کہیے کہ تو نہیں آگاہ — اک قیامت بپا ہے یاں سرِ راہ
کچھ چھپا تو نہیں رہا یہ راز — اک جہاں اس سے ہے خبر پرداز
پس تغافل ہوا ترحم کر — گوشِ دل جانبِ تظلم کر

کون کہتا ہے رہ نہ محوِ ناز
پر نہ اتنا کہ جی سے جائے نیاز

ان بلاؤں پہ ان نے صبر کیا — اختیار اپنے جی پہ جبر کیا
اس طرف کا نہ دیکھنا چھوڑا — اُس کے اندوہ سے نہ منہ موڑا

اور یہ ماجرا ہوا مشہور   شور رسوائیوں کا پہنچا دور

دیکھ کر اس کو بے خور و بے خواب   جانا ہر اک نے عاشق بیتاب

منہ پر اُس کے جو رنگِ خون نہیں   عشق ہے اس کو یہ جنون نہیں

ہے نگہ اُس کی جس طرف مائل   اس طرف ہی گیا ہے اُس کا دل

جب ہوا ذکر اقل و اکثر میں   چاہ ثابت ہوئی اسی گھر میں

عشق بے پردہ جب فسانہ ہوا
مضطرب کد خدائے خانہ ہوا

گھر میں جا بہر دفع رسوائی   بیٹھ کر مشورت یہ ٹھہرائی

یاں سے یہ غیرتِ مہ تاباں   جا کے چندے کہیں رہے پنہاں

شب محافے میں اُس کو کر کے سوار   ساتھ دے ایک دایۂ غدار

پار دریا کے جلد رخصت کی   اس طرح فکر رفعِ تہمت کی

گھر تھا اک آشنا کا مدِ نگاہ   واں ہو روپوش تا یہ غیرتِ ماہ

ہوئے جب اس بلا سے خاطر جمع
نور افزائے خانہ ہو جوں شمع

گھر سے باہر محافہ جو نکلا   اس جواں ہی کے پاس ہو نکلا

طپشِ دل سے ہو گیا آگاہ   ہو لیا ساتھ اُس کے بھر کر آہ

واں کے رہنے سے اُس کو کام نہ تھا   وہ گلی اس کا کچھ مقام نہ تھا
جی سے جس کو کماں ہوا اُلفت   جس سے دل کی درست ہو نسبت
جنبش اس کی پلک کو گر واں ہو   دل میں یاں کاوشِ نمایاں ہو
واں اگر مو شکست کا ہو باب   یاں رگِ جاں کو ہووے پیچ و تاب
واں اگر پاؤں میں لگے ہے خار   دل سے یاں سر نکالے ہے یکبار
یار کو دردِ چشم گر ہووے   چشمِ عاشق لہو ہی تر ہووے
چاک دامن ہیں واں پئے زینت   یاں گریباں ہیں چاکِ گل کی صفت

واں دہن تنگ یاں ہے دل تنگی
حُسن اور عشق میں ہے یک رنگی

دست افشاں وہ پاے کوباں بُد   تھا محافے کے ساتھ گرم رہ
قطرہ زن اشک سادہ راہ تمام   در پئے یار تھا یہ بے آرام
ہر قدم تھا زباں پہ جاری   خواب ہے یا کہ ہے یہ بیداری
ہمسری اس کی تھی میسر کب   ہے مجھے بختِ واژگوں سے عجب
شوق مُفرط نے بے تہی کی سخت   تو شکیبی نے دل سے باندھا رخت
رفتہ رفتہ سخن ہوئے نالے   اڑنے لاگے جگر کے پر کالے
اضطراب دلی نے زور کیا   ان نے بے اختیار شور کیا

دل کے غم کو زبان پر لایا — آفتِ تازہ جان پر لایا
کاے جفا پیشہ و تغافل کیش — اک نظر سے زیاں نہیں کچھ بیش
منہ چھپایا ہے تونے اس پر بھی — نگہِ التفات ایدھر بھی
صبر کس کس بلا سے کر گزروں — چارہ اس بن نہیں کہ مر گزروں
منزلِ وصل دور میں کم پا — تجھ کو اس مرتبے میں استغنا
ہے تو نزدیک دل سے اے طناز — لیک تجھ تک سفر ہے دور و دراز
ناز نے یک نفس نہ رخصت دی — آئینہ نے تجھے نہ فرصت دی
تو تو واں زلف کو بنایا کی — جان یاں پیچ و تاب کھایا کی
تجھ کو تھی اپنے خالِ رخ پہ نگاہ — دل مرا مبتلائے داغِ سیاہ
تجھ کو مدِ نظر تھی اپنی جمال — میں ستم کش ہوا کیا پامال
بسترِ خواب پر تجھے آرام — مجھ کو خمیازہ کھینچنے سے کام
واں لبِ لعل تیرے خنداں تھے — یاں فشردہ جگر پہ دنداں تھے
ناز و خوبی نے دل دیا نہ تجھے — رحم سے آشنا کیا نہ تجھے

اب تغافل نہ کر تلطف کر
حال پر میرے ٹک تاسف کر

گوش زد دایہ کے ہوئے یہ سخن — تھی وہ استاد کارِ حیلہ و فن

پاس اس کو بلا تسلّی کی — وعدۂ وصل سے تشفّی کی
کاٹے ستم دیدۂ غمِ دوری — ہو چکا اب زمانِ مہجوری
زار نالے نہ کر شکیبا ہو — عشق کا راز تا نہ رسوا ہو
دل قوی رکھ نہ جی کو کاہش دے — چل کوئی دم کہ داد خواہش دے
سخت دل تنگ تھی یہ غیرتِ ماہ — قطع تجھ بن نہ ہو سکی تھی راہ
گرچہ یہ حسن اتفاق سے ہے — اس کی بھی جذب اشتیاق سے ہے
تیرے آنے سے دل کشادہ ہوا — نشۂ دوستی زیادہ ہوا
بزمِ عشرت کریں گے باہم ساز — ہو جواب اپنے دوست کا دمساز
دے کر اس کو فریب ساتھ لیا — دل عاشق کو اپنے ہاتھ لیا

لیک در پردہ اُن نے یہ ٹھانی
کیجیے اس سے خصمی جانی

یہ تو دل تفتۂ محبّت تھا — سخت وارفتۂ محبّت تھا
وقت نزدیک تھا جو آ پہنچا — تا سر آب پا بہ پا پہنچا
آب کیسا کہ بحر تھا زخّار — تند و موّاج تیرہ و تہ دار
موج کا ہر کنایہ طوفان پر — مارے چشمک حباب عمّاں پر
ہم کنارِ بلا ہر اک گرداب — لجّہ سرمایہ بخشِ تیرہ سحاب

گندِ موج جب نہ تب دیکھا ساحل اس کا نہ خشک لب دیکھا
کشتی اک آن کر ہوئی موجود ہو فلک سے ہلال جیسے نمود
کی کنارہ پہ لا کے استادہ تھا محافہ رکوب آمادہ
اس سفینہ میں جلد جا پہنچا یہ بھی واں ساتھ ہی لگا پہنچا
بیچ دریا میں دایہ نے جا کر کفش اس گل کی اس کو دکھلا کر
پھینکی پانی کی سطح پر اک بار اور بولی کہ او جگر افگار
حیف تیرے نگار کی پاپوش موجِ دریا سے ہووے ہم آغوش
غیرتِ عشق ہے تو لا اس کو چھوڑ مت یوں برہنہ پا اس کو
اس طرف آب کے اترنا ہے اس نواحی کی سیر کرنا ہے
پاؤں اس کے جو ہیں نگار آلود ظلم ہے ہوویں گر غبار آلود
جس کفِ پا کو رنگِ گل ہو بار منصفی ہے کہ خار سے ہو فگار
ان پہ نرمی میں گل سے ہوں جو پرے آبلہ چشم کو سیاہ کرے
یہ روا ہے تو اپنے حال پہ رو مفت ناموسِ عشق کو مت کھو

جی اگر تھا عزیز اے ناکام
کیوں عبث عشق کو کیا بدنام

سن کے یہ حرفِ دایۂ مکّار دل سے اس کے گیا شکیب و قرار

بے خبر کارِ عشق کی تہ سے — جست کی اُس نے اپنی جاگہ سے

تھا سفینہ میں یا کہ دریا میں — موجِ زنجیر ہو گئی پا میں

کھنچ گیا قعر کو یہ گوہرِ ناب — تھی کشش عشق کی مگر تہِ آب

کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں — لیکن ایسے کوئی نکلتے ہیں

ڈوبے جو یوں کہیں پہ جا نکلے — غرقِ دریائے عشق کیا نکلے

عشق نے آہ کھو دیا اس کو

آخر آخر ڈبو دیا اس کو

جب کہ دریا میں ڈوب کر وہ جواں — کھو گیا گوہرِ گرامیِ جاں

دایۂ حیلہ گر ہوئی دل شاد — واں سے کشتی چلی برنگِ باد

خار خارِ دلی سے فارغ ہو — لے گئی پار اس گلِ نو کو

یہ نہ سمجھی کہ عشق آفت ہے — فتنہ سازی میں اک قیامت ہے

خاک ہو کیوں نہ عاشقِ بیدل — کام سے اپنے یہ نہیں غافل

وصل جیتے نہ ہو میسّر اگر — لاوے معشوق کو یہ تربت پر

یاں سے عاشق گئے اگر ناشاد

خاکِ خوباں بھی ان نے دی برباد

قصہ کوتاہ بعد یک ہفتہ — آئی وہ رشکِ مہ ز خود رفتہ

کہنے لاگی کہ اب تو اے دایہ
ہو گیا غرق وہ فرو مایہ

اب تو وہ ننگ درمیاں سے گیا
آرزو مند اس جہاں سے گیا

تھے جو ہنگامے اُس کے حد سے زیاد
ساتھ اُس کے گئے وے شور و فساد

شور فتنہ تھے اس تلک سارے
اب تو بدنامیاں نہیں بارے

دل تڑپتا ہے متصل میرا
مُرغِ بسمل ہے یا کہ دل میرا

وحشتِ طبع اب تو افزوں ہو
حال جی کا مرے دگرگوں ہو

بے دماغی کمال ہوتی ہے
جان تن کے وبال ہوتی ہے

دل کوئی دم میں خون ہووے گا
آج کل میں جنون ہووے گا

بے کلی جی کو تاب دیتی ہے
طاقتِ دل جواب دیتی ہے

جی میں آتا ہے ہوں بیابانی
پر کہوں ہوں کہ ہے یہ نادانی

مصلحت ہے کہ مجھ کو لے چل گھر
ایک دو دم رہیں گے دریا پر

گاہ باشد کہ دل مرا وا ہو
ورنہ کیا جانئے کہ پھر کیا ہو

دایہ بولی کہ اے سراپا ناز
حسن کا در پہ تیرے روئے نیاز

اب تو ہی فتنہ کو سلایا ہے
اس بلا کے تیئں بٹھایا ہے

کون مانع ہے گھر کے چلنے کا
سدِ رہ کون ہے نکلنے کا

ہو محافہ میں دل خوشی سے سوار ‏ شاد شاداں کر آپ سے تو گذار
دل سے اپنے پدر کے غم کم کر ‏ مادرِ مہرباں کو خرم کر
کر ملاقات ہمدموں سے تو ‏ گرمِ بازی ہو محرموں سے تو
یہ نہ سوچ کہ بد بلا ہے عشق ‏ گھات میں اپنی لگ رہا ہے عشق
جس کسو سے یہ پیار رکھتا ہے ‏ عاقبت اس کی مار رکھتا ہے
جذبے اپنے جب کرے ہے کام ‏ عاشقِ مردہ سے بھی لے ہے کام
صبح گاہاں وہ غیرتِ خورشید ‏ اس جگہ سے رواں ہوئی نومید
پہنچی نصف النہار دریا پر ‏ روئی بے اختیار دریا پر

حد سے افزوں جو بے قرار ہوئی
وایہ کشتی میں لے سوار ہوئی

حرف زن یوں ہوئی کہ اے دایہ ‏ یاں گرا تھا کہاں وہ کم مایہ
موج سے تھا کدھر کو ہم آغوش ‏ تھا تلاطم سے کس طرف ہمدوش
تجھ کو آیا نظر کہاں آ کر ‏ پھر جو ڈوبا تو کس جگہ جا کر
مجھ کو دیجو نشاں اس جا کا ‏ میں بھی دیکھوں خروش دریا کا
ہوں میں ناآشنائے سیرِ آب ‏ ناشناسائے موج و گرداب
تجھ کیا لطمہ کس کو کہتے ہیں ‏ گھر میں ہم نام سنتے رہتے ہیں

ہیں میسر کہاں یہ سیر عبور
اتفاقی ہیں اس طرح کے امور

مکر میں گرچہ دایہ تھی کامل — لیک تہ سے سخن کی تھی غافل
یہ نہ سمجھی کہ ہے فریب عشق — ہے یہ مہ پارہ ناشکیب عشق
بیچ دریا کے جا کہا یہ حرف — یاں ہوا تھا وہ ماجرائے شگرف
یاں وہ بیٹھا حباب کی مانند — پھر نہ تھا کچھ سراب کی مانند

سنتے ہی یہ کہاں کہاں کر کے
گر پڑی قصدِ ترکِ جاں کر کے

موج ہر اک کمندِ شوق تھی آہ — لپٹی اس کو برنگ مار سیاہ
دام گسترده عشق تھا تہ آب — جس کے حلقے تمام تھے گرداب
حُسن موجوں میں یوں نظر آوے — نورِ مہتاب جیسے لہراوے
تھیں وہ اس کی حنائی انگشتاں — غیرت افزائے پنجۂ مرجاں
سر پہ جس دم کہ آب ہو کے بہا — سطح پانی کا آئینہ سا رہا
کششِ عشق آخر اس مہ کو — لے گئی کھینچتی ہوئی تہ کو
کودے غواص و آشنا سارے — تا بہ مقدور دست و پا مارے
کھینچ کر کوفت سب ہوئے بیتاب — نہ لگا ہاتھ وہ دُرِ نایاب

جا باہم آغوشِ مردہ یار ہوئی تہ میں دریا کے ہمکنار ہوئی

پاک کی زندگی کی آلائش
ہو گئے دست و بغل کی آسائش

سر پٹکتی جو گھر گئی دایہ آفت اک لے گئی نئی دایہ
ابّ و عمّ مادر و برادر سب خاک افشاں بسر و نالہ بر لب
دار و دستہ تمام اس گل کا ترکِ آئین کر تحمّل کا
سوئے دریا رواں ہوئے گریاں آتشِ غم سے دل جگر بریاں
خلق یک جا ہوئی کنارے پر حشر برپا ہوئی کنارے پر
کام داروں سے سب نے کام لیا آخر ان کو اسیرِ دام کیا

نکلے باہم وے موئے نکلے
دونوں دست و بغل ہوئے نکلے

ربط چسپاں بہم ہویدا تھا مر گئے پھر بھی شوق پیدا تھا
ایک کا ہاتھ ایک کی بالیں ایک کے لب سے ایک کو تسکیں
جو نظر اُن کو آن کرتے تھے ایک قالب گمان کرتے تھے
کیا لکھوں مل رہے وہ وصلی دار ہم دگر سے جُدا ہوئے دشوار
کیوں نہ دشوار ہووے اُن کا فصل جان دے دے ہوا ہو جن کو وصل

حیرتِ کارِ عشق سے مردم　　شکلِ تصویر آپ میں تھے گم

مقولۂ شاعر

میرؔ اب شاعری کو کر موقوف　　عشق ہے ایک فتنۂ معروف
قدرت اپنی جہاں دکھاتا ہے　　اس سے جو تو کہے سوا آتا ہے
کتنی وسعت ترے بیان میں ہے　　کتنی طاقت تری زبان میں ہے

لب پہ اب مہرِ خامشی بہتر
یاں سخن کی فرامشی بہتر

مثنوی بحر المحبت

لبِ زخمِ قلم ذرا وا ہو
تا کہیں تجھ سے نالہ پیدا ہو

ساتھ کاغذ کے عشق بازی کر
یعنی کچھ داستاں طرازی کر

کسی خستہ جگر کے حال کو لکھ
کسی سرو رواں کی چال کو لکھ

ناشکیبی کسی کی دکھلا دے
دل فریبی کسی کی لکھوا دے

کہیں پیچاکِ آہ کر تحریر
دے بنا زلف کی کہیں زنجیر

قصۂ عشقِ لیلےٰ و مجنوں
گرچہ کچھ اس قدر نہ تھا مضموں

تیری طرّاحیوں سے دُور کھنچا
کئی اہلِ سخن نے اس کو لکھا

مبتذل عشق کا نہ ہو مضموں
عشق موزوں کو پھر بھی کر موزوں

گرچہ ہے کلکِ میرؔ نادرہ کار
تو بھی ندرت کو اپنی کر اظہار

جن مقاموں میں رنگ کم ہے بھرا
دے ذرا اور بھی تو حسن ملا

سطح کاغذ پہ کھینچ وہ تصویر
جس سے حیراں رہیں صغیر و کبیر

رمزِ شق القمر جتا دے تو
معجزہ اپنا ٹک دکھا دے تو

آغاز داستانِ آں جواں

ایک تھا اک جوانِ خوش ظاہر
تھا نپٹ فنِ عشق میں ماہر
دل پہ صدمے بہت اٹھائے تھے
داغ پر داغ اس نے کھائے تھے
اس کی نظریں چڑھی تھیں لاکھ نگاہ
دیکھیاں تھیں ہزار چشم سیاہ
بہ تقاضائے عشقِ سنجیدہ
لیکن اس پر بھی تھا وہ غم دیدہ
گر کبھیں رو ئے خوش نظر آتا
نوکِ مژگاں تلک جگر آتا
ہو کے ممنونِ ناشکیبیٔ شوق
تھا نظر بازِ دلفریبیٔ شوق
تپشِ دل کو راہ تھی اس سے
چشمِ حیرت نگاہ تھی اس سے
گاہ گلزار کی طرف جاتا
جی کو گل پھول ساتھ بہلاتا
گاہ کرتا نظارۂ در و بام
گاہ تھا کوچہ گردی اس کا کام
از دحامِ زناں جہاں ہوتا
آب ہو کر وہاں رواں ہوتا

کیا کہوں ایک دن وہ خوش پرکار
کر کے سیرِ چمن بہ فصلِ بہار

گھر کو آتا تھا عشق بازانہ
گل بدستارِ نوجوانانہ

کہ کسی کوچہ میں جو جا نکلا
اُس کے بھی دل کا مدّعا نکلا

دل تھا اُس کا جو عشق آمادہ
ہو گیا اک جگہ پہ دلدادہ

یعنی اک نازنین گل رخسار
ہوئی غرفہ میں اس سے آکے دوچار

اُس کی آنکھ اس پہ اس کی اُس پہ پڑی
یک دگر جب بہم نگاہ لڑی

جوں یہ اس کے سما گئی جی میں
دول کچھ اس کے بھی آگئی جی میں

دل نے جب لگ کے راہ پیدا کی
لبِ خامش نے آہ پیدا کی

حوصلہ خوں مژہ پہ ہو کے بہا
ضبط پر ضبط کچھ نہ اس کا رہا

آنکھیں بے اختیار بھر آئیں
پلکیں ندیاں سی کچھ نظر آئیں

اشک آحائلِ نظارہ ہوئے
جگر و دل ہزار پارہ ہوئے

طائرِ رنگ کر گیا پرواز
ہو گیا صعوہ صیدِ چنگلِ باز

لب کو دنداں کے ساتھ ربط ہوا
لوگ سمجھے کہ اس کو خبط ہوا

دل کے ٹکڑے جگر کے پرکالے
آنکھوں نے اُس کے آگے لا ڈالے

جب کہ مانند تیر خوردہ شکار
واں سے جنبش ہوئی اسے دشوار

دیکھ اُسے رفتۂ دل بصد انداز
اٹھی غرفے سے وہ سراپا ناز

پہلے شعلہ سا کچھ بلند ہوا　　پھر وہ غرفہ میں وہیں بند ہوا

ورقِ غرفہ میں جو کہ تھی تصویر

صاف غائب ہوئی وہ بدرِ منیر

جونہی نظروں سے چھپ گیا وہ ماہ　　نظر آیا جہاں کو روزِ سیاہ

جان مضطر ہو تن سے جانے لگی　　بے خودی میں غشی سی آنے لگی

خشکی دوڑی جگر سے تا بہ زباں　　اشک آہی گئے سرِ مژگاں

بس کہ حال اس گھڑی تباہ ہوا　　متصل صرف آہ آہ ہوا

پاس ناموس کا اٹھا کھٹکا　　سر کو اس آستاں پہ دے پٹکا

شیشۂ دل کو چور چور کیا　　پیرہن چاک کر کے دور کیا

گئی سو بار سوئے غرفہ نگاہ　　پر نہ آئی نظر وہ غیرتِ ماہ

تپشِ دل نے بات ہی کھودی　　بیقراری نے گھات ہی کھودی

جان ہونٹوں پہ آئی آہ کے ساتھ　　لو ہو آنے لگا نگاہ کے ساتھ

سوزشِ دل دوچند ہونے لگی　　سر سے آتش بلند ہونے لگی

صبر بھاگا بدیدۂ گریاں　　ناشکیبی سے بندھ گیا پیماں

آہ حسرت کا گھر بنا دلِ زار　　گرم پہلو کیا بہ بسترِ خار

منہ پہ مل کر کے اس گلی کی خاک　　صبح آسا کیا گریباں چاک

تب تو بلوائے خاص و عام ہوا — سر پہ اُس کے اک اژدہام ہوا
جان کر لوگ اُس کو سودائی — بہ تبسم ہوئے تماشائی
جس کا ناگہ ہوا ادھر سے گزار — وہ رہا دیکھ اس کو حیراں وار
تھے جو ہم بزم بزمِ ہشیاری — اور جتاتے تھے مرگ تک یاری

عشق کی حالتِ تباہ دیکھ چلے
آئے ٹھہرے گھر سے ہٹے کہ چلے

الغرض یونہی گزرے جب کئی ماہ — ہوئی اس کے بھی دل میں اس کی راہ؟
اس کو بھی اک خیال رہنے لگا — جی ہی جی میں ملال رہنے لگا
صاحبِ خانہ تھا زبس کہ غیور — دیکھ کر اس گلی میں یہ سر و شور
مشورت ہر کسی سے کرنے لگا — مارے غیرت کے سخت ڈرنے لگا
خشم گاہے کہے کہ مار ہی ڈال — جوں بنے اس بلا کو سر سے ٹال
لطف گاہے کہے تساہل کر — دیکھ ہوتا ہے کیا تامل کر
قتل عاشق روا نہیں ہرگز — یہ کسی نے کیا نہیں ہرگز
وہ کرے گا تو ہووے گا بدنام — اپنے مذہب میں جو برا ہے کام
آخرِ کار تھے جو محرمِ کار — ایک دن ان کو جمع کر اک بار
مصلحت جو ہوا کہ کیا کیجے — کچھ مجھے اس کا مشورہ دیجے

کیونکہ سر سے ٹلے یہ رسوائی — تب انہوں نے یہ بات ٹھہرائی

یعنی اوباش کوچہ و بازار — کچھ نہ کچھ اس کو دیویں آ آزار

اس پہ گو سینکڑوں ستم ہوویں

پر نہ بدنام اس میں ہم ہوویں

جب یہ ٹھہری تو کودکانِ شریر — ساتھ لے کر کے اپنے جمع کثیر

یک بیک اس جوان پر دھائے — لڑکے کیا آئے اک بلا لائے

سنگ ماری کسی نے اس پہ کی — خاک باری کسی نے اس پہ کی

کوئی اس سے بہ قہر پیش آیا — طعنہ زن کوئی مثلِ نیش آیا

کوئی تلوار سے ڈرانے لگا — اس پہ برچھی کوئی اٹھانے لگا

ہاتھ کھینچا کسی نے اس کا بزور — کوئی غصے سے آیا بر سر شور

کوئی بولا کہ یاں سے اُٹھ جالے — سانگ لایا ہے تو یہاں کیا بنے

کچھ کسی نے کہا خشونت سے

کوئی بولا جو راہِ شفقت سے

اس کو دونوں کی کچھ نہ تھی پروا — کہ وہ زنہار آپ ہی میں نہ تھا

تھا ز خود رفتہ اُس کی یاد کے بیچ — ہو گیا تھا گم اتحاد کے بیچ

گرچہ تھا اس کے سر پہ حشر بپا — پر نہ دیکھے تھا ٹک وہ سر کو اٹھا

پیش چشم آئی کے اس پری کا خیال
اور غمزے کی کافری کا خیال

لبِ خامش سے گفتگو اس ساتھ
اس خرابہ میں آرزو اس ساتھ

کبھو پاؤں پہ سر کو رکھ دینا
کبھو چٹ چٹ بلائیں لے لینا

کبھو کہنا کہ میں ترے قربان
آرزو ہے کہ جاوے میری جان

کبھو کہنا کہ غرفہ میں آ تو
اپنا دیدار پھر بھی دکھلا تو

جان آنکھوں میں آئی ہے میری
تو بھی بے اعتنائی ہے تیری

گھر میں جا بیٹھتے ہیں پردہ نشیں
پر نہ ایسے کہ پھر نہ نکلیں کہیں

پاسِ الفت سے راہ رکھتے ہیں
بام و در پہ نگاہ رکھتے ہیں

ہاتھ غرفہ سے جب نکالتے ہیں
اس سے افتادہ کو سنبھالتے ہیں

کبھو کرتے ہیں بن بہ شکلِ پری
بر سرِ صحنِ بام جلوہ گری

کبھو روزن پہ رکھ کے چشم سیاہ
دور تک پھینکتے ہیں تیرِ نگاہ

دیکھتے ہیں کسی غریب کا حال
اور دکھاتے ہیں اس کو اپنا جمال

نہ کوئی آشنا نہ ہمدم ہے
ہے جو ہمدم تو بس ترا غم ہے

ایک تو ہوں میں زیست سے بیزار
تس پہ کھینچوں ہوں سینکڑوں آزار

کوئی آ کر مجھے ستاتا ہے
کوئی تیغ و تبر دکھاتا ہے

کوئی آمادہ ملامت ہے
کوئی نشتر زنِ شناعت ہے

کوئی مجھ سے مکاں چھڑاتا ہے — یار کا آستاں چھڑاتا ہے
کوئی کہتا ہے ہے یہ سودائی — یاں سے بہتر ہے اس کی بے جائی
ایک جان اور اضطراب ہے یہ — مجھ پہ دن رات اب عذاب ہے یہ
تو ہی بتلا کہ میں کدھر جاؤں — موت آتی نہیں کہ مر جاؤں
ہجر میں بس کہ جی سے تنگ ہوں میں — اپنی ہستی کا اب تو ننگ ہوں میں
بام پر آ کے ٹک نظارہ کر — سوئے تیغ نگہ اشارہ کر
کہ میرا کام بس تمام کرے — میرا قصہ ہی انصرام کرے
کب تلک ان اذیتوں کو سہوں — کب تلک ان مصیبتوں میں رہوں
چاہ کی ہو گئی ہے پردہ دری — رہ نہ پردہ میں تو بھی رشک پری
کہ نہایت ہے تبہ حال مرا — مجھ سے چھوٹا نہیں خیال ترا

آہ کب تک جیا کروں غمگیں ؟
صبر کرتا پہ کیا کروں کہ نہیں

رات دن اس کا جو یہ ڈھنگ رہا — کچھ نہ پھر پاس نام و ننگ رہا
کھنچ گئی طول اس کی رسوائی — پر نہ غرفہ میں وہ پری آئی
قصہ مشہور ہو گیا اس کا — نہ رہا حسن و عشق میں پردہ
یعنی افشا ہوا یہ سینہ فگار — ہے اسی نازنیں کا عاشق زار

نت سوئے غرفہ ہے نگاہ اُس کی — برق سی کوندتی ہے آہ اس کی

منہ نہیں موڑتا جفاؤں سے
ربط ہے اس کو دل کی چاہوں سے

وارث اس نازنیں کے دیکھ یہ حال — لائے سو سو طرح سے دل میں خیال

جب نہ بن آئی اور کچھ تدبیر — یہی سوچے کہ اب بلا تاخیر

یاں سے لے جا کے اس صنم کے تئیں — چند پوشیدہ رکھیں اور کہیں

طور پر اپنے واں یہ زیست کرے — پھر بہ دلدادہ یاں جئے کہ مرے

پار دریا کے اک ٹھکانہ تھا — ان کا کوئی وہاں یگانہ تھا

ان سے اور اُن سے تھی شناسائی — دوستی یک دلی و یک جائی

اعتماد یگانگت بھی تھا — اتحادِ موانست بھی تھا

شاہدِ مہر جب ہوا روپوش — اور شب آئی ہو گلیم بدوش

اک محافہ میں کر سوار اُسے — ساتھ دایہ کے بھیجا پار اُسے

کہہ دیا یوں کہ یاں یہ رشکِ بہار — ان دنوں رات دن رہے تھی زار

خود بخود اس کے دل پہ غم تھا کچھ — بے جہت متصل الم تھا کچھ

دن کو بستر پہ زار رہتی تھی — شب کو اختر شمار رہتی تھی

خواب اور خور میں آ گیا تھا قصور — اس کو تبدیل تھا مکان ضرور

اس لیئے ہم نے اس کو واں بھیجا	کہ بیاباں کی راس آئے ہوا
مثل گل وا ہو اس کا غنچہ دل	ہلے چھاتی سے اس کے غم کی سل

لطف اٹھائے ہوائے صحرا کا
دیکھے وا شد ہوا ئے دریا کا

کر محافہ میں اس پری کو سوار	لے چلی جب وہ دایۂ مکار
جوں ہی باہر وہ رہگذر سے ہوا	گذر اُس کا جواں کے سر سے ہوا
بوئے اُنس اس سے اس کو آہی گئی	اس کی آنکھ اس کی گھات پا ہی گئی
دل میں اس کے قلق نے جوش کیا	سر پہ بے صبری نے خروش کیا
واں سے پائے ثبات اکھڑنے لگا	متصل سر پہ ہات پڑنے لگا
عشق کہتا تھا تو نہ ٹل یاں سے	جذب کہتا تھا چل نکل یاں سے
سچ ہے وہ جو غلام الفت ہے	کشف اس کا مقام الفت ہے
دل آگہ نے دی یہ اس کو خبر	کہ محافہ میں ہے وہ رشک قمر
اب ترا اس گلی میں کام ہے کیا	تو بھی ہمراہ ہو برنگ صبا
جس طرف جائے وہ ادھر جا تو	دیکھنا واں فریب مت کھا تو
یہ سمجھ جب وہ اس کے سات ہوا	مورد چشم التفات ہوا
دل میں وحشت کہ کیا کہے کوئی	جی پہ آفت کہ چشم خوں روئی

ساتھ اس کے یہ درمند اسیر
کشش دل کی پاؤں میں زنجیر

دایہ وحشت سے پیش و پس نگراں

پیچھے دایہ کے قطرہ زن یہ جواں

سر بہ زانو محافہ میں وہ پری
جوں قفس میں ہو کوئی کبک دری

دل میں گھر چھوٹنے کا اُس کو ملال
اور رسوائیوں کا اپنی خیال

کہ یہ کیا افترا بندھا مجھ پر
زہر کھا کون مر گیا مجھ پر

میری آنکھوں نے کس کو خون کیا
میری پلکوں نے کس کو ریش کیا

کس پہ خواہش سے کی نظر میں نے
چھوڑا کس کے سبب سے گھر میں نے

کس سے میں آہ ہم کلام ہوئی
کس سے نظارہ بازِ بام ہوئی

کس سے میں نے کیا پیام و سلام
کس کی اُلفت سے میں ہوئی بدنام

کس سے غرفہ میں میں لڑائی آنکھ
کس کو روزن سے میں دکھائی آنکھ

چاکِ پردہ سے میں نے جھانکا کب
میری ویرانی کا ہے کچھ بھی سبب

یہ عجب خانماں خرابی ہے

کہ نکلنا یہ ایں شتابی ہے

اسی صورت جوانِ غم دیدہ
بہ خیالِ محال پیچیدہ

چشم در راہ کہ ہر آئے خدا
دے محافہ کا پردہ باد اٹھا

دیکھنے نا دے ماہِ پردہ نشیں　　　جس کی خاطر مذلتیں یہ سہیں

کھول دے گو نہ اس کا منہ سارا　　　اک جھلک کا تو ہو دے نظارہ

تھا محافہ وہ ڈوریوں سے کسا　　　اس میں دشوار تھا گذارِ صبا

نہ رہی جب کہ اس میں طاقتِ صبر　　　جیب پھاڑا بہ مرگِ حضرتِ صبر

کر کے نالہ بہ طرح سوز و گداز　　　یوں قرینِ محافہ دی آواز

کاے پری چہرہ اتنی روپوشی　　　جی سے گزرا میں ہائے خاموشی

نہ تو آواز ہی سناتی ہے　　　نہ تری بو ہی مجھ تک آتی ہے

ہے گھٹا ٹوپ یا محافہ یہ　　　ٹک تو پردہ اٹھا دے غیرتِ مہ

کہ بھلا اک جھلک تو میں دیکھوں　　　تیری صورت کی ڈھلک تو میں دیکھوں

خوبرو کرتے ہیں تغافل سب　　　پر نہ اتنا کہ ہوئے محض غضب

داغ ہے انتظار آنکھوں میں　　　خون ہے بجائے یار آنکھوں میں

تجھ کو اپنی ستم گری کی قسم　　　تجھ کو غمزے کی کافری کی قسم

قسم اپنے تجھے تغافل کی　　　قسم اپنے تجھے تجاہل کی

حرف زن اپنے درد مند سے ہو

گرم اے آتش اس سپند سے ہو

سن کے دایہ یہ اس کا طرزِ کلام　　　ہو مخاطب بہ التفاتِ تمام

پاس اس کو بلا کے آہستہ | یوں لگی کہنے اے جگر خستہ

یاس کو دے جواب گھر جاوے | دردِ حرماں سے کہہ کہ مر جاوے

آہ و نالہ سے کہہ کہ رخصت ہو | گرمِ رفتار راہِ فرقت ہو

کیونکہ نزدیک ہے زمانِ وصال | ہجر تھا جو ہوا وہ خوابِ خیال

اب کوئی دم کو ہم وثاقی ہے | دیر منزل تلک کی باقی ہے

جب کہ منزل پدید ہووے گی | شب تیری روزِ عید ہووے گی

آ اب اس درد و غم کو جانے دے | دُور دُور اس صنم کو جانے دے

شب کو مل ہی رہے گا تو اس سے | اب کنارہ ہی خوب ہے اس سے

کیونکہ ہے اس میں بیم بدنامی | تو چلا چل ابھی بنا کامی

اک ذرا اب تو دل کو ڈھارس دے | چل کے منزل پہ جامِ عشرت لے

تیرے آنے سے یہ ہوئی دل شاد | کیونکہ ملنا ترا تھا اس کی مراد

جی سے چاہے تھی ہمرہی تیری | اس کو رستہ میں یاد تھی تیری

بارے اس کے بھی دل کی داد ملی | حق سے جو مانگی تھی مراد ملی

پیچھے پیچھے تو کیا بجا آیا | مثلِ سایہ جو یوں لگا آیا

غرض اس کو لگا کے باتوں میں

ہوئی وہ دشمنی کہ گھاتوں میں

جی میں ٹھانی کہ کچھ دغا کیجے — سر سے اس بد بلا کو وا کیجے
کیجئے رستہ ہی میں کام اس کا — گو کہ ہے وعدہ تا بہ شام اس کا
غافل از کار یہ ستم دیدہ — تھا جو باتوں میں اس کی گرویدہ
اس کو ہرگز بہ اشتیاق وصال — نہ رہا کچھ فریبِ زن کا خیال
الحذر مکر حیلۂ زن سے — خاص مکّار اور پُر فن سے
ہیں جو دلّال پیشگانِ شریر — بازی کھاتا ہے ان سے چرخِ اثیر
زورِ رستم نہ چل سکے جن پر — خاکساروں کی کیا چلے ان پر
اسی مذکور پر تھا سب کو گوش — کہ ہوا سامنے سے بحر کا جوش
آئی درخشندگیٔ آب نظر — عرصہ خشکی کا رہ گیا کم تر
حاملانِ محافہ یعنی کہار — یوں چلے جلد جوں نسیم بہار
ساتھ دایہ کے وہ جوانِ نزار — جس طرح قافلہ کے پیچھے غبار

تھا جہاں بحر پر محافہ دھرا
قطع راہ کرکے واں ہی آپہنچا

بحر کیسا کہ اژدہائے سیاہ — جس کی صورت سے خوف کھائے نگاہ
قطرہ اس کا ہر ایک طوفاں خیز — موج بحرِ بلا کی لنگر ریز
شکلِ ساحل دہانِ درندہ نہنگ — عرصہ لطموں سے ہر حباب پہ تنگ

شورِ محشر سے شورِ آب قریں
صورت اس کی تمام چیں بہ جبیں

صفِ ماہی وہ بر سرِ طغیاں
ہر جگہ اس میں چار موج عیاں

اس میں تیرے کثافت بہ بیتابی
مثلِ طائر بہ سانِ مرغابی

غوطہ زن تھی بہ مدِّ جزر شلنگ
بطِ چرخ اس میں صورتِ خرچنگ

سونس و گھڑیال اس میں وحش بلاکش
سر بسر اضطراب و جملہ خروش

دامنِ محشر اس کا آدھا پاٹ
کر قیاس اس سے اس کا سارا پاٹ

شکل دستِ دعا ہر ایک صدف
سر چھپائے ہوئے سپر میں کشف

لطمہ ساحل پہ تیغ زن ہر بار
موجِ آب اس کی افعیِ خونخوار

چاہِ زنداں تھا اس کا ہر گرداب
جس میں ڈوبے تھے کتنے خانہ خراب

دیکھ ان کو عبور کا مائل
کشتی اک آ لگی تہ ساحل

پیش و پس اس پہ سب سوار ہوئے
سب سے آگے محافہ دار ہوئے

دایہ کشتی میں دیدہ بازِ حباب
اور محافہ میں وہ پری بیتاب

شورِ دریا سے اُس کے دل میں بیم
غنچہ جیسے صدف میں دُرِّ یتیم

دوا تر وہ جوانِ دل دادہ
جیسے تصویرِ ششدر استادہ

دایہ مصروفِ سیرِ آبِ رواں
ہم شگافوں سے وہ پری نگراں

پہنچی کشتی جو بیچ میں یک بار
ہوئی سرگرمِ حیلہ وہ غدّار

امتحاناً بروئے سطحِ آب
یعنی کفش اس پری کی گری تہِ آب

تھا جو منظور اس کو جاں لینا
پھر کہا یہ کہ ہاں میاں لینا

ہاتھ اس کے سے کی جو کفش نے جست
لیا موجوں نے اس کو دست بدست

ہوئی جا کر بزیرِ آب رواں
خاتمِ دستِ پنجۂ مرجاں

قعرِ دریا میں جب کہ جا پہنچی
سیپ کے سر پہ پشتِ پا پہنچی

ہو کے وہ کفش تاجِ فرقِ حباب
ہو گئی پل میں گوہرِ نایاب

تھا جواں بس کہ سخت دلدادہ
ہو کے ناگہ بمرگ آمادہ

کفش پر کر دراز اپنا ہاتھ
آشنایانہ کودا ہاں کے ساتھ

کودتے ہی چلا گیا تہ کو
طے کیا عمقِ آب کی رہ کو

کفش کے ساتھ ہی گیا تہِ آب
ہوا غوّاصِ گوہرِ نایاب

گوہرِ جاں نثارِ کفش کیا
نہ ذرا انتظارِ کفش کیا

کفش ساتھ اُس کو اپنے لے ڈوبی
نہ غلط بلکہ پا کی محبوبی

نہ وہ اچھلا نہ کفش ہی اچھلی
عقل حیرانِ کار اس کی ہوئی

کُودے ہر چند غوطہ خور بھی واں
نہ ملا آب سے کچھ اس کا نشاں

جان لینے پہ عشق کا ہے مدار　　یہی شیوہ ہے اس کا آخر کار

کون عاشق ہوا کہ مر نہ گیا　　کس کا چاہت کے بیچ گھر نہ گیا

کر سکے کون عاشقوں کا شمار　　اس کے ہاتھوں موئے پڑے ہیں ہزار

قیس سے اس نے دوں سلوک کیا　　خون دوں کوہکن کا جا کے لیا

کس کی طاقت کہ ہو بہ غور نگاہ　　اس کے طرزِ فریب سے آگاہ

کر چکی جب کہ دایہ اس کا کام　　پر مشوش ہوئی وہ ماہ تمام

خاطرِ دایہ گرچہ جمع ہوئی　　پانی پانی وہ رشکِ شمع ہوئی

لیک تھا اختیارِ دایہ زبس
اس کو سوجھی نہ غیر ضبطِ نفس

واں سے کشتی رواں ہوئی فی الفور　　کہ کہیں کچھ بلا نہ آوے اور

لے گئے اس صنم کو پار شتاب　　رہی وحشت میں چشم اس کی حباب

لہریں خمیازہ کھینچ کھینچ موئیں　　مچھلیاں غم سے ہمکنار ہوئیں

آب نے دل ہی دل میں کھایا جوش　　لبِ ساحل بھی رہ گیا خاموش

گرچہ وہ حیلہ گر ہوئی خرم　　کشتی والوں کو تھا پر اس کا غم

یہ نہ سمجھے کہ عشقِ خانہ خراب　　جمع کرتا ہے وصل کا اسباب

ایسی صورت سے وہ بھی منہ کو چھپائے　　اس پری کو بھی زیرِ آب بلائے

دے کے رخصت میں جام مدہوشی　　دلوے پھر رخصت ہم آغوشی
طرح ہو زیر آب صحبتِ وصل　　یوں میسر ہو ان کو خلوت وصل
یہ حمائل کرے دو دست اس کے　　چومے وہ لعل مے پرست اس کے
لب سے لب کامیاب ہو تہِ آب　　دوستی کا حساب ہو تہِ آب

اس کی محنت کشی کی دلوے داد
اس کی خود کامیوں سے ہووے شاد

ہو کے روپوش وہ جو غیرتِ ماہ　　رہی یک چند واں بہ حال تباہ
ایک دن دایہ سے کہا آکر　　مجھ کو اکثر رہے ہے دردِ جگر
یہ مکاں بھی نہ سازگار ہوا　　دل مرا یاں بھی بے قرار ہوا
گھر کو لے چل کہ جس کا تھا خطرہ　　اب تو وہ مدعیِ جاں نہ رہا
ساری اس کے سبب سے تھی آفت　　وہ نہیں اب تو کیا ہے پھر تہمت
کوئی اب اس کا دادخواہ نہیں　　اُس کی باتیں اسی کے ساتھ گئیں
اس سے اب جی میں تو نہ لا وسواس　　طبع نازک کا رکھ تو میری پاس
کون جانے ہے وہ کدھر کو گیا　　مر گیا یا کسی نگر کو گیا
کیونکہ اب دل پہ اک اذیت ہے　　درد ہے رنج ہے مصیبت ہے
کیونکہ دل میرا یاں نہیں لگتا　　وہی وحشت ہے اور وہی سودا

ہے سراسیمگی وہی دنبال | ہے وہی زیست میرے جی کا وبال

پاؤں کھنچتے ہیں راہِ صحرا لے | ہاتھ کھنچتے ہیں جیب کو آلے

بے کلی ہے مدام میرے تئیں | کچھ ہوا صبح و شام میرے تئیں

سر پہ کوہِ گرانِ غم سا ہے | پہلوئے دل میں کچھ الم سا ہے

یہ نہیں ہیں کہ اڑ کے گھر جاؤں | جی رُکا آئے ہے کدھر جاؤں

کچھ تو تدبیر میری کر تو شتاب | بیٹھی جاتی ہوں ورنہ مثلِ حباب

سفر دُور کا ہے قاصد جان

تیرے صدقہ یہ میرا کہنا مان

سُن کے دایہ نے یوں کہا طنّاز | ناز پر تیرے صدقے اہلِ نیاز

ہوں میں آمادۂ تہیّہ کار | اتنی کرتی ہے مجھ سے کیوں تکرار

سچ ہے اب تو مٹی وہ بدنامی | اور سر آیا زمانِ ناکامی

دل کو خوش رکھ کنارہ کر غم سے | اب ملایا تجھے اب و عم سے

پوچھنے جوتکی سے جاتی ہوں | تیری خاطر محافہ لاتی ہوں

ملیو تو شاد شاد ماں سے پری | کیجیو ہمدموں میں جلوہ گری

یاں تو مضمون دایہ تھا کچھ اور | عشق کا واں کنایہ تھا کچھ اور

عشق سے عقل کب بسر آوے | زور ٹک اُس کا کیا نظر آوے

کون سمجھے ہے اس کی بات کو ہائے
کون سمجھے ہے اس کی گھات کو ہائے

اس کے مخفی چلن ہیں سب سے جدا
ان سے واقف نہیں سوائے خدا

اس کی گرمی سے پائے سنگ گدازؔ
ہو وے حرفِ نیاز صاحبِ نازؔ

جاں دو قالب کی ایک اس سے ہو
بد ہو گر یار نیک اس سے ہو

ہے فریبندگی ہی اس کی روش
نہیں زلفِ پری میں ایسی کشش

جس کو اس نے بزیرِ دام کیا
اس سے ناکامیوں سے کام لیا

نہیں عشاق کُش ہے یہ جلاد
اس سے معشوق بھی گئے ناشاد

نہ بچا کوہکن سے تا شیریں
ساتھ خسرو کے دی سُلا شیریں

مرگِ لیلیٰ کو گاہ سبقت دے
قیس کو چند روز مہلت دے

الغرض یاں کے قافلہ میں ہمیش
حُسن اور عشق دونوں ہیں پس و پیش

ان کو باہم جدا نہ جانے کوئی
مطلقاً بے وفا نہ جانے کوئی

بے وفائی وفا کا نام ہے یاں
کچھ ادائی ادا کا نام ہے یاں

مردہ ان کا ہے زندۂ جاوید
ناامیدی ہے یاں تمام امید

ہجر میں وصل جاودانی ہے
ہجر عاشق کی زندگانی ہے

حاصل اس سے کہ دایۂ خدّار
واں سے چلنے پہ جب ہوئی تیار

صبح ہی منہ کو اپنے ملتے خاک / مہر نکلا وہ لے گریباں چاک

لے محافہ چلے وہاں سے کہار / آئے دریا کے متصل اک بار

لبِ ساحل پہ جب کہ آ پہنچے / غرقہ بولا میری دُعا پہنچے

انتظارِ تو می کشتم تہِ آب / غرقۂ بحر ہجر را دریاب

روز پہنچا تھا کچھ قریبِ یاس / کہ ہوا اس کو انتشارِ حواس

بیقراری جو موج میں آئی / گریہ مژگاں کے اوج میں آئی

دیکھ دریا کو رو دیا اُس نے
صبر اپنا ڈبو دیا اُس نے

ہوا کشتی پہ جب محافہ سوار / دایہ اُس کی جو تھی امانت دار

اس سے پوچھا کہ دایہ سچ بتلا / کس مکاں پر وہ خستہ ڈوبا تھا

کفش پھینکی تھی تو نے کس جاگہ / مجھ کو لے چل ذرا تو اس جاگہ

میں بھی دیکھوں تو واں کی شورشِ آب / بہ مرادم رسم تہِ گرداب

کفش پر میری جی دیا اُس نے / یا الٰہی یہ کیا کیا اُس نے

یہ ترنگ اُس کے جی میں کیا آئی / کہیں ہوتے ہیں ایسے سودائی

کفش میں ایسی کیا کرامت تھی / کفش والی تو میں سلامت تھی

اس کی نادانی جی کھپاتی ہے / اب کوئی دم میں جان جاتی ہے

پھر بدل کر زباں بہ نازو ادا — بولی وہ نازنیں ہوا سو ہوا
دایہ موجوں کا پیچ و تاب تو دیکھ — اور یہ زنجیرہ حباب تو دیکھ
کیا ہی جاتا ہے تیز آبِ رواں — ہم نے دیکھا نہ تھا کہیں یہاں
آہ جاتے تو پردہ پوش تھے ہم — شرمِ بیگانہ سے خموش تھے ہم
اب جو پردہ ذرا اٹھایا ہے — دل نے ذوقِ نظارہ پایا ہے
دلکشا سطحِ آب کی ہے فضا — سرد لگتی ہے کیا ہی جی کو ہوا

کاش کشتی کھڑی کریں کوئی دم
نا نکالوں میں اپنے جی کا غم

دایہ غافل تھی از ادائے کلام — ہنس کے کہنے لگی کہ سیم اندام
دیکھ لے اس جگہ وہ ڈوبا تھا — میں یہیں کفش تیری پھینکا تھا
کفش کے ساتھ ہی ہوا وہ غرق — کفش میں اس میں کچھ رہا تھا نہ فرق
یاں ہی اس کا مقام و منزل ہے — موج اس کی نشانِ ساحل ہے
سنتے ہی یہ سخن وہ پا بہ رکاب — گر پڑی اس جگہ پہ جوں سیماب
ساتھ اپنے نہ دایہ جاں لی — رہ شہر و دیارِ جاناں لی
غوطے پانی میں متصل کھائے — حسن نے طرفہ جلوے دکھلائے
موجیں آغوش ہو کے آ لپٹیں — لپٹیں بانو کے تا قفا لپٹیں

ڈوبتے ہی بہار لایا حُسن — آب بر روئے کار لایا حُسن

نظر آئے بدیدہ حضار — گوہر تر سے اُس کے دو رخسار

دیکھ اس ماہ کی روشنیِ تہِ آب — ہو گئیں یک بار ماہیاں بے تاب

دستِ رنگیں جو اُس کا تھا دلکش — دی لگا اُس نے اور بھی آتش

مار و کژدم کنارہ گیر ہوئے — حلقۂ زلف میں اسیر ہوئے

جذبۂ عشق ہو کے راہ نما — اس کو بھی زیرِ آب لے ہی گیا

الغرض زندگی سے سیر ہوئی — مُردہ عاشق کو پہنچی لیک موئی

مُردہ با مُردہ ہم کنار ہوا — وصل دریا میں ایک بار ہوا

گرچہ علمِ شنا کے ماہر کار — دست و پا مارتے رہے اک بار

لیکن اُس کا کہیں نشاں نہ ملا
لیا دریا نے اس گہر کو چھپا

دایہ مایوس واں سے گھر آئی — کہنے یہ حرف ہائے رسوائی

ماجرا تھا جو کچھ کیا اظہار — تب تو آگہ ہوا اس کے خویش و تبار

پدر و مادر اور ہمسائے — لبِ دریا پہ سر زناں آئے

اشک ریزاں کوئی کوئی نالاں — کوئی خاکِ سیہ بسر و مالاں

کوئی دامن تلک گریباں چاک — کوئی حیران بازیِ افلاک

لب ساحل پہ اژدہام ہوا
اتنے میں جو تلاش دام ہوا

دام دار آگئے دام بر سرِ دوش
حلقہ ان داموں کے تمام آغوش

از پئے صید ماہیٔ سیمیں
پہنچے جا کر کے تا بہ قعرِ زمیں

دام پہنچا جو زیرِ آب تلک!
کیا کہوں تجھ سے اس گھڑی کی جھلک

دو ہم آغوش دام میں نکلے
پکے اپنے وہ کام کے نکلے

لب سے لب آشنائے بوسۂ شوق
ہاتھ دونوں کے دوگلوں کے طوق

ساقِ پا ساقِ پا سے پیچیدہ
یک دگر عضو عضو گردیدہ

سینہ سینہ کے ساتھ شیر و شکر
جس میں خالی ذرا نہ جائے نظر

نظر آئے وہ دونوں ماہِ منیر
جیسے اک آئینہ میں دو تصویر

دیکھ اس واقعہ کو پیر و جواں
دیر تک واں کھڑے رہے حیراں

تھی جدائی بہم زبس دشوار
سب تھے ناچار ہو کے آخر کار

خاک میں یا ملا دیا اُن کو
آگ میں یا جلا دیا اُن کو

مصحفی بس زباں درازی بس
آفریں ہے مقامِ ضبطِ نفس

مجھ سے یہ مثنوی ہوئی جو تمام
رکھا بحر المحبت اس کا نام

قصّہ ہے ایک اور دو نامے ‏ ‏ ‏ جیسے اک شخص کے ہوں دو جامے

میرؔ صاحب نے پہلے نظم کیا ‏ ‏ ‏ میں نے بعد ان کے ریزہ پرزہ کیا

ایک دو ریزہ پرزہ جاں افروز ‏ ‏ ‏ ہوا نایاب جامۂ گل دوز

کچھ نہیں ہے مرقع تصویر ‏ ‏ ‏ ہے مرقع وصلے لباس فقیر

جیسے میروں میں شان ہے کچھ اور ‏ ‏ ‏ ہم فقیروں میں شان ہے کچھ اور

ہے توقع کہ صاحبِ انصاف ‏ ‏ ‏ مجھ کو اس گفتگو میں رکھیں معاف

کچھ میرے حق میں خیر و شر نہ کہیں
نہ کہیں بد بھی نیک گر نہ کہیں

مآخذ

۱۔ آبِ حیات: محمد حسین آزاد مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۵۴ء

۲۔ اردو مثنوی کا ارتقا: پروفیسر عبدالقادر سروری حیدر آباد دکن۔ ۱۹۴۰ء

۳۔ اردو تنقید پر ایک نظر۔ کلیم الدین احمد مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۷ء

۴۔ اردو مثنوی کا ارتقا: (شمالی ہند میں) ڈاکٹر سید محمد عقیل مطبوعہ الہ آباد یونیورسٹی ۱۹۶۵ء

۵۔ انتخاب مثنویات میر: مرتبہ سر محمد سلیمان شاہ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۴۳ء

۶۔ تاریخ مثنویات اردو: جلال الدین جعفری مطبوعہ شرکت مصنفین لاہور

۷۔ دلی کا دبستان شاعری، ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۴۹ء

۸۔ دلی کالج میگزین (میر نمبر) مرتبہ نثار احمد فاروقی مطبوعہ دلی کالج ۶۲ء

۹۔ لکھنؤ کا دبستان شاعری: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مطبوعہ اردو مرکز لاہور ۱۹۵۵ء

۱۰۔ دیباچہ بحر المحبت مرتبہ عبد الماجد دریا بادی مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۳۴۶ھ

۱۱۔ ذکر میر: مرتبہ مولوی عبد الحق مطبوعہ انجمن ترقی اردو ۱۹۳۳ء

۱۲۔ کلیات میر، مرتبہ عبد الباری آسی مطبوعہ نولکشور پریس لکھنؤ ۱۹۴۱ء

۱۳۔ مصحفی اور اُن کا کلام: ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی مطبوعہ شیخ مبارک علی لاہور

۱۴۔ میر تقی میر، حیات اور شاعری: ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی مطبوعہ انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۹۵۴ء

۱۵۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ۱۹۶۲ء

۱۶۔ یورپ میں دکھنی مخطوطات: مرتبہ نصیر الدین ہاشمی مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۹۳۲ء

۱۷۔ اردوئے معلی علی گڑھ بابت ماہ جون ۱۹۰۶ء

۱۸۔ نگار لکھنؤ اردو شاعری نمبر ۱۹۳۵ء

۱۹۔ نگار لکھنؤ اصناف سخن نمبر ۱۹۵۷ء

۲۰۔ نگار لکھنؤ مصحفی نمبر ۱۹۳۷ء

نواب مرزا شوق لکھنوی
کی تین مثنویاں
فریب عشق ، بہار عشق ، زہر عشق

یہ اپنی فنی عظمت اور زبان و بیان کی خوبیوں کے لحاظ سے اُردو کی مشہور مثنویوں میں شمار ہوتی ہیں۔ ان میں وہ سب کچھ ہے جو حقیقی شاعری میں ہونا چاہئے۔ فریب عشق رنگین مزاجوں کی آتش شوق بھڑکاتی ہے، بہار عشق درد مندان محبت کے دل چھینتی ہے اور زہر عشق دیوانہ بنا دیتی ہے۔ یہ مثنویاں عرصے سے نایاب تھیں اب ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے عالمانہ مقدمے کے ساتھ تینوں یکجا شائع کر دی گئی ہیں۔

قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

آئینۂ ادب ، چوک مینار ، انار کلی
لاہور